V.S Kashmir

ریاست کا ساٹھ سالہ سیاسی دور

کشمیر کی سیاسی انقلاب



تحریر Shabnam Qayum

شبنم قیوم

V.S

DS
485
.K2
Q13
1989
v.5

(جملہ حقوقِ طبع بحق مصنف محفوظ ہیں)

بار اوّل : ۱۹۸۹ء

کتابت : وجیہہ رقم رامپوری
طباعت : جے، کے، آفسیٹ پرنٹرز دہلی
سرورق : سجود سیلانی

قیمت: -/50 روپے

ناشر :
کشمیر بک سینٹر امیرا کدل سرینگر کشمیر

(ترجمہ یا کسی طرح استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینی ضروری ہے، تبصرہ کے لیے حوالہ جات دینے میں کوئی قید نہیں ہے)

کشمیر کا

سیاسی انقلاب

جلد پنجم

v.5

از ابتدائے جنوری ۱۹۷۵ء تا ستمبر ۱۹۸۲ء

ایک تاریخ

ایک تحریک

ایک دستاویز

شبنم قیوم

Shabnam Qaiyum

کاشانۂ ادب بوچھوارہ ڈلگیٹ سرینگر کشمیر

انتساب!

اُن کشمیری عوام کے نام!

جنھوں نے اندھی عقیدت میں مبتلا ہوکر
اپنی جہالت کا مظاہرہ کرکے اُن ہاتھوں کو
مضبوط کیا جن کے بارے میں اقبالؔ نے کہا تھا:

توڑ اُس دستِ جفا کیش کو یارب جس نے
رُوحِ آزادیٔ کشمیر کو پامال کیا

(شبنم قیّوم)

حرفِ اول

سنو اے ساکنانِ ارضِ کشمیر　　صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا ایک لمحہ ہے بہتر　　غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

غلامی سے آزادی تک کا راستہ دشوار، سنگلاخ اور پیچدار بھی ہے لیکن آسان بھی ـــ! کہا گیا ہے۔

دشوار گذار راہوں سے گزرنے والی قومیں غلامی کے بندھن توڑ کر جب آزادی کی سانس لیتی ہیں تو اُن کا مستقبل تابناک ہوتا ہے بلکہ ان کی قربانیاں ان کے گرد ایسا حصار کھینچتی ہیں کہ پہاڑ بھی سرنگوں ہو کر ان کے قدموں میں آجاتے ہیں۔ ایسی قوم جب کبھی اور جہاں کہیں اپنے کسی ارادے کا عزم کر لیتی ہے تو اُس کا جوش جنون عمل کی راہ اختیار کر لیتا ہے لیکن دوسروں پر نگاہیں رکھنے اور ساحل پر کھڑے موجوں پر تکیہ کرنے والے آزادی کی طلبگار قوم کی جھولی میں اگر آزادی ڈال بھی دی جائے تو یہ آزادی دوسروں کے ہاتھوں کی محتاج رہتی ہے

سال ہوں، دن ہوں یا مہینے، قوموں کی تاریخ میں ان کی اہمیت مؤرخ کے لیے ہمیشہ سنگ میل کی طرح نمایاں رہتی ہے۔ آئندہ نسلیں اسی آئینے میں آبا و اجداد کے نقش و نگار تلاش کرتی ہیں اور اپنے مقصود کے انہی لکیروں پر سفر کرتی ہیں۔ اگر ماضی کے سن و سال تاریخ کے سپرد کرتے وقت احتیاط کا دامن چھوڑ جائیں تو پھر یہ اوراق قوموں کے مقدر کو پریشان کر دیتے ہیں اور ایسی ایک ٹھوکر سے مستقبل کی ساری عمارت ڈھیر ہو جاتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے عوام کی آزادی موسم کے ساتھ بدلتی ہے جس طرح کشمیر کا

موسم بے اعتبار ہے اسی طرح یہاں کی آزادی بھی اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔ یوں تو ہم بھی برصغیر کے ساتھ آزاد ہوئے اور تحریکِ حرّیت میں جس ڈوگرہ شاہی سے ہم برسرِ پیکار تھے، وہ برصغیر کی تقسیم کے بعد غلامی کا دفتر بند کر کے چلی گئی ۱۹۴۷ء میں عوامی راج کے ساتھ ہم سے کہا گیا کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک ہم بالکل آزاد تھے۔ لیکن پھر حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ ہم سے کہا گیا نہیں تم آزاد نہیں بلکہ غلام ہو، غلامی کا جو نیا احساس دلایا گیا اس نے ہمیں ایک بار پھر اسی ڈگر پر لا کھڑا کیا جہاں پر پہلے تھے، غلامی کا تقاضا ہے کہ اس کے خلاف لڑو، اور تب تک لڑو جب تک کہ تم اسے شکست نہ دو۔ چنانچہ غلامی کے خلاف لڑنے کے لیے ہم میدان کارزار میں اُتر آئے، برسوں بیت گئے، کافی مالی اور جانی نقصان اٹھانے کے بعد ہم سے کہا گیا تمہاری قربانی بارآور ثابت ہوئی اور تم آزاد ہو گئے۔

آزادی کی اس لڑائی میں کون جیتا اور کون ہارا ــــ ؟ یہ الگ بات ہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے ؟ کیا ہم واقعی آزاد ہیں، اگر ہم ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوئے تھے تو ۱۹۵۳ء میں ہمیں غلام کس نے بنا دیا۔ اگر آج ۱۹۵۳ء سے بھی بدتر سیاسی صورتحال ہے تو ہم کیسے آزاد ہیں

کشمیر کی سیاست کا سیمابی مزاج آزادی کے مزاج سے ہم آہنگ لگتا ہے اور جموں و کشمیر کی سیاست اتنی تیزی سے بدلتی رہتی ہے کہ یہ کہنا کہ ہم کس گھڑی آزاد اور کس گھڑی غلام ہیں وثوق سے کہنا مشکل ہے۔

جو لوگ جس قسم کے ماحول میں رہتے ہیں اسی قسم کے اثرات ان کے خیالات اور جذبات پر بھی مرتّب ہوتے ہیں۔ سائینسی ایجادات اور مواصلات کی ترقی نے ملکوں اور قوموں کے درمیان جو فاصلے مٹا دیئے اس کی اثر پذیری سے اور تو اور سیاست بھی بچ نہ سکی، دہلی اور سرینگر کے درمیان زمینی سفر دو دن کا اور ہوائی سفر ایک گھنٹہ کا ہے۔ لیکن دہلی اور سرینگر کے درمیان مسافر چاہے زمینی ہو یا ہوائی وہ اپنے کپڑے بدل دیتا ہے۔ سرینگر سے دہلی جائے گا تو گرم کپڑے اتار دے گا اور اگر دہلی سے سرینگر آئے گا تو سرد کپڑے اتار دے گا۔ چونکہ یہاں کا موسم چولے بدلتا رہتا ہے۔ لہٰذا سیاست نے بہت حد تک اس کا اثر قبول کر لیا ہے۔

اس رائے سے سبھی متفق ہیں کہ انسان پیدائش سے ہی آزاد رہنے کا متمنی ہے اور وہ کسی کا غلام بن کر اپنی آزادی سے محروم ہونا نہیں چاہتا ہے انسان کی فطرت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں پر برتری حاصل کرنا چاہتا ہے وہ زندگی میں اپنا ایک منفرد مقام حاصل

کرنے کی تمنا رکھتا ہے۔ انسان کی جبلّت میں یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ و بلند مرتبہ حاصل کرنے کے لیے اپنی عقل و شعور سے کام لیتا ہے،

• چونکہ حیوان عقل اور شعور سے عاری ہے لہٰذا مرتبہ حاصل کرنے یا غلامی و آزادی کی تمیز کرنے کی اُسے نہ کوئی ضرورت ہے نہ مجبوری۔

غلامی ایک ایسی گٹھڑی ہے جس میں بے شرمی، بے حرمتی اور بے عزّتی باندھی گئی ہوتی ہے۔ اور غلام شخص اس گٹھڑی کو اثاثہ سمجھ کر اپنے ساتھ لیے رہتا ہے۔ غلامی ایک ایسا بوجھ ہے جس کے تلے انسان کا دم گھٹتا رہتا ہے۔ غلامی میں احساس سو جاتا ہے ضمیر مر جاتا ہے، اور ایمان کمزور ہو جاتا ہے۔ آزادی میں انسان اپنا حق پہچان لیتا ہے اور اپنے حقوق کی استطاعت رکھتا ہے، آزادی انسان کے اندر سے ڈر اور خوف نکال دیتی ہے جبکہ غلامی ایک فرد کا ہی نہیں بلکہ قوموں کا کردار مایوسی کی حد تک متاثر کر دیتا ہے، غلامی کا ربط محکومیت سے ہے اور محکومیت انسانی قدر و منزلت کو مٹا کر رکھ دیتی ہے۔ مفکّروں کا کہنا ہے آزاد زندگی کے چند لمحات غلامانہ زندگی کے سالہا سال سے بہتر اور افضل ہیں۔

غلامی کی زنجیر کو لعنت بھی کہا جاتا ہے جبکہ آزادی ایک عظیم نعمت سے تعبیر کی جاتی ہے لعنت اور نعمت کے درمیان جو تفاوت ہے وہ غلامی اور آزادی کو منقسم کرتا ہے۔

غلامی میں آزادی کے حصول کی تڑپ احساس بیداری کی نشانی ہے، جو فرد یا افراد اس احساس سے سرشار ہیں وہ غلامی کا جوا اتار پھینکتے ہیں، دنیا میں آزادی کی جنگ ایک زمانہ سے جاری ہے اور اب تک بے شمار قومیں آزاد ہو بھی چکی ہیں۔

انسان جو فطرتاً آزادی کا متلاشی ہے۔ اس کے پیچھے اس کا یہ مقصد کارفرما ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی زندگی متعین کر سکے۔ اور زندگی کے بال و پر کھول کر اپنے لیے وہی مقام حاصل کر سکے جو اللہ نے اس کے لیے ودیعت کیا ہے۔

جس کسی انسان میں آزادی اور غلامی میں فرق کرنے کی تمیز نہ ہو۔ اس کو انسانوں کے زُمرے میں شامل کرنا یقیناً انسان کی توہین کے مترادف ہے، غلامی پر وہی شخص رضامند ہو سکتا ہے جس کا احساس مر چکا ہو جس کے ضمیر پر مردنی چھائی ہوئی ہو اور جس کے ایمان میں لغزش آ چکی ہو، بے شک آزادی حاصل کرنے کی شئے ہے۔ اور جو اس

شئے کو حاصل کر کے پاتا ہے وہ اس کی قدر و قیمت جان جاتا ہے آزادی کی خاطر عزیز جانیں قربان کرنا پڑتی ہیں۔ تختہ دار پر چڑھنا پڑتا ہے، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، اور تب کہیں جا کر آزادی کی وہ نعمت حاصل کی جاتی ہے جس کے سامنے تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔

غلامی اور آزادی کے بارے میں یہ تفاوت ریاست کے عوام میں اُجاگر کرنے کے لیے عوامی رہنما میدان کارزار میں اُتر آئے اور عوام کو حصولِ آزادی کے لیے للکارنے لگے۔ عوام نے آزادی کے معنی و مطلب سمجھ کر اس کے حصول کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا، عوام نے مالی اور جانی قربانی بھی دی، وہ تختۂ دار پر بھی چڑھے اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کر گئے۔ عوام نے یہ سب کچھ برداشت کیا، تب جا کر ان کی آزادی کا سورج طلوع ہوا، آزادی کے سورج کی اس روشنی اور تمازت سے ابھی ہم بار آور بھی نہیں ہونے پائے تھے کہ بادلوں نے اس سورج کو ڈھانپ لیا۔ ان بادلوں کے ہٹنے کے انتظار میں برسوں بیتے ان برسوں میں انتظار کی لذت میں ہم ایسے محو ہو گئے کہ ہمارے سامنے آزادی اور غلامی کا تصور ہی مٹ گیا۔

ہم سے کہا جا رہا ہے کہ بادل چھٹ گئے ہیں اور سورج پھر نمودار ہوا ہے، لیکن جن لوگوں کے نزدیک آزادی اور غلامی کا تصوّر ہی مٹ گیا ہو، ان کے سامنے آزادی کا ڈھنڈورا پیٹنا بھینس کے آگے بین بجانے کے برابر ہے۔

ریاست جموں و کشمیر واحد ریاست ہے جہاں کرسی بدلنے کے ساتھ آزادی بھی بدل جاتی ہے۔ اور آزادی کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔ اگر رہنمایانِ قوم کرسی پر براجمان ہیں تو کہا جا رہا ہے اس کی حفاظت کرو کیونکہ بڑی قربانیوں کے بعد یہ آزادی حاصل کی گئی ہے ہاں اگر وہ کرسی پر نہیں ہیں تو کہا جاتا ہے ہم غلام بن کر نہیں رہیں گے آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے، اور یہ آزادی حاصل کر کے ہی ہم رہیں گے۔ ان حالات میں یہاں کے باشندے حتمی طور پر یہ کہنے کی پوزیشن میں نہیں کہ ہم آزاد ہیں یا غلام ــــ ؟

برصغیر کی تقسیم کے بعد آج تک یہاں کے عوام کو آزادی اور غلامی کے مخمصے میں اس قدر اُلجھایا گیا کہ یہ فیصلہ کرنا بہت ہی مشکل ہے کہ آزادی کب آئی اور غلامی کب گئی۔

ریاست میں جب سیاسی بیداری کا آغاز ہوا تو اس وقت یہاں کی زبوں حالی پسماندگی اور غربت کا سارا الزام اسی غلامی پر ڈالا گیا جس غلامی کا طوق ہماری گردنوں میں اس وقت ڈالا گیا جب یہاں کے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ڈوگروں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔ ڈوگرہ رجواڑوں نے یہاں کی اکثریت کو انسان کے بجائے ڈھور ڈنگر سمجھ لیا، اس صورتِ حال کے خلاف آخر کار ایک احتجاج ہوا جس نے تصادم کی صورت اختیار کر لی، عوام نے بے شمار قربانیوں کے بعد غلامی کا چولا اُتار پھینکا۔ آزادی کا جامہ اوڑھنا چاہا تو آواز آئی ٹھہرو ــــ! ابھی یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ تم آزاد ہو یا غلام؟ قبل اس کے کہ کوئی حتمی فیصلہ ہو جاتا، ایک بار اور اس قوم کا سودا ہوا ایکبار اور اس کا بھاؤ مقرر کیا گیا۔

پہلے بیعنامۂ امرتسر کے تحت ہماری خرید و فروخت ہوئی، پھر بیعنامہ دہلی ہوا۔ پہلے سودے میں بیچنے والے اور خریدنے والے دونوں غیر تھے۔ دوسرے سودے میں اپنے ہی اپنے تھے ایک وہ تھا جس نے عوام کے اندر آزادی کا احساس جگایا اور دوسرا وہ جو طویل جدوجہد کے بعد آزادی کی نعمت سے سرفراز ہوا تھا۔

خرید و فروخت کا یہ سودا کچھ اس انداز سے ہوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی سب لوگ اس انتظار میں رہے کہ کوئی ہم سے کہہ دے۔ ہم آزاد ہیں یا غلام! اس انتظار کے دوران صبح کو کہا گیا تم آزاد ہو اور شام کو کہا گیا نہیں ابھی تم غلام ہو، شام کو آزادی کا مژدہ سُنایا گیا تو صبح کو غلامی کی خبر دی گئی۔ اس صبح و شام کے تضاد نے ہمیں اتنا بے بہرہ کر دیا ہے کہ ہم آزادی اور غلامی کی تمیز ہی کھو بیٹھے۔ اور یہ تمیز کھونا ایسی بدقسمتی ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں

شبنم قیوم



کشمیر ایکارڈ کے بانی

مسز اندرا گاندھی۔ شیخ محمد عبداللہ

باب (۱)

دہلی اور کشمیر کے درمیان بات چیت

کشمیر ایکارڈ کے لیے مختلف پڑاؤ

آبروئے ضبط و خودداری فنا کرنی پڑی
ہم کو جینے کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی

جُز :- صفحہ

۱۔ ہندوستان کے ساتھ کشمیر ایکارڈ کی تکمیل
پاکستان کا مخالفانہ ردِّ عمل ۱۵

۲۔ وزارت کی تشکیل اور ضمنی انتخاب
محاذ رائے شماری کا کفن دفن ۳۳

۳۔ اعلیٰ عہدے کا ناجائز استعمال
کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی آپسی چپقلش ۴۱

۴۔ کشمیر میں جنتا پارٹی کا قیام
نیشنل کانفرنس کی نئی حکمتِ عملی ۶۱

۵۔ الیکشن مہم میں نیشنل کانفرنس کا
ایک نیا اپروچ ۶۹

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

ہندوستان کے ساتھ کشمیر ایکارڈ کی تکمیل

پاکستان کا مخالفانہ ردِّ عمل

مسئلہ کشمیر کے بارے میں ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک شیخ محمد عبداللہ نے اتنے متضاد بیانات دیئے کہ اگر کسی کمپیوٹر پر اس کا حساب رکھا گیا ہوتا تو وہ کمپیوٹر بھی پریشان ہوگیا ہوتا اور پریشانی سے تنگ آکر اس نے بھی اپنا سر کسی دیوار کے ساتھ ٹکرا کر پھوڑ لیا ہوتا، چونکہ عام کشمیری مسلمان کمپیوٹر کے مقابلے میں ذرہ بھر بھی حساس نہیں، اس لیے نہ ہی پریشان ہوا اور نہ ہی اس نے اپنا سر پھوڑا۔

کشمیری قوم کے ہر دل عزیز لیڈر سرینگر میں جو بیان دیتے جموں جاکر اس کو بدل دیتے اور دہلی میں اس کی تردید کرتے، دہلی میں جو بیان دیتے وہ جموں میں بدلتے اور سرینگر آکر اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔

شیخ محمد عبداللہ کی سیاسی زندگی کا تضاد اور ان کے متضاد بیانات نے کشمیری عوام کو اتنا الجھا دیا کہ آج اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی بیشتر لوگ نہیں سلجھتے نہ جانے کبھی یہ سلجھیں گے بھی کہ نہیں۔

ایک جگہ مسئلہ کشمیر میں پاکستان کو فریق بنا دیا تو دوسری جگہ اس کی ٹانگیں کھینچ لیں تیسری جگہ اسے اٹھا کر دور پھینک دیا، حد تو یہ ہے کہ دور پھینک دینے کے بعد مصلحتاً اسے پھر اٹھا کر اپنے پاس لاکر رکھ دیا۔

کشمیری عوام کے ساتھ ساتھ جب انھوں نے پاکستان کو بھی پریشان کر دیا تو ۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء کو وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے کیمبل پور کے جلسہ عام میں

عوام سے خطاب کے دوران فر



"شیخ محمد عبداللہ اب تک دو بار غلطی کر چکے ہیں اور اگر انھوں نے تیسری غلطی کی تو یہ اُن کی آخری غلطی ہوگی .....!"

اس کے بعد ۲۹ جنوری کو گجرات کے دورے کے دوران ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے جموں و کشمیر کے دونوں طرف رہنے والے عوام اور پاکستان کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اندرا عبداللہ معاہدے کا اعلان ہو جانے کے بعد آنے والے پہلے جمعہ کو ایک دن کی احتجاجی ہڑتال کریں۔

انھوں نے مزید کہا اس سمجھوتہ سے مسئلہ کشمیر حل نہیں ہوگا اور پاکستان اپنے اس موقف سے دستبردار نہیں ہوگا، مسئلہ کشمیر حق خود ارادیت کی بنیاد پر انجمن اقوام متحدہ کی پاس شدہ قراردادوں کے مطابق حل ہونا چاہیے، اندرا عبداللہ معاہدے سے بین الاقوامی عہد و پیمان اور فیصلے متاثر نہیں ہوں گے یہ ایک گٹھ جوڑ ہے۔ شیخ عبداللہ نے اب تک دو غلطیاں کی ہیں اور یہ اُن کی تیسری آخری اور سب سے بڑی غلطی ہوگی۔ شیخ صاحب قدرتی راستہ کھولنے کی باتیں کر رہے ہیں وہ قدرتی راستہ پر آجائیں تو قدرتی راستہ بھی کھل سکتا ہے۔

(ذوالفقار علی بھٹو تقریر کرتے ہوئے)



"میرا ہڑتال کرانے کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ معاہدہ ہمیں منظور نہیں۔"

شیخ عبداللہ نے ذوالفقار علی بھٹو کے اس بیان سے سیخ پا ہو کر جہاں اسے فضا کو زہر آلود بنانے والا بیان قرار دے کر پاکستانی لیڈروں پر سخت ترین الفاظ میں تنقید کی وہاں عوامی مجلس عمل کے سربراہ مولوی فاروق نے مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لیے رائے شماری کے موقف کو دہرایا۔

۱۴ فروری کو انھوں نے جامع مسجد کے اجلاس میں فرمایا:

"کسی جماعت یا لیڈر کے موقف بدلنے یا رائے شماری کے نصب العین سے دست بردار ہونے سے عوامی حقوق سلب نہیں ہو سکتے۔ وزارتی تبدیلی مسئلہ کشمیر کا حل نہیں ہو سکتا۔"

مولوی فاروق نے وزیر اعظم پاکستان کی ہڑتال کی کال کو حق بجانب قرار دے کر اس پر عمل کرنے کا اعادہ کیا، جماعتِ اسلامی نے بھی اندرا عبداللہ سمجھوتے کو گٹھ جوڑ کہہ کر اسے مسترد کیا اور واضح کر دیا کہ:

"اگر بھارت نے اس مسئلہ کو سلامتی کونسل کی قراردادوں اور شملہ سمجھوتہ کے تحت متنازعہ مان لیا ہے تو اُسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ کسی فرد واحد کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اُسے دفنانے کی کوشش کرے، اس مسئلہ کو ہندوستان پاکستان اور کشمیری عوام باہمی مشورے سے حل کر سکتے ہیں۔"

جموں و کشمیر کی پیپلز لیگ جس کا قیام یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء عمل میں آیا تھا اس نے اس گٹھ جوڑ کے بارے میں شدید ردِ عمل دکھایا۔ پیپلز لیگ کے جوشیلے جوان فضل الحق قریشی، نذیر احمد وانی، اسلم وانی، عبدالحمید پٹھان، شبیر احمد شاہ، فاروق احمد بٹ، محمد صدیق عادل، محمد اعظم انقلابی محمد فاروق رحمانی اور حمید اللہ بٹ وغیرہ نے پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل پر ہڑتال پر نہ صرف لبیک کہا بلکہ عوام سے اس میں بھرپور حصہ لینے کی اپیل کی۔

محاذ رائے شماری کی طرف سے مجاہد منزل میں آئے دن اس معاہدے کے بارے میں بیانات جاری ہوتے رہے، کبھی یہ بیانات مرزا افضل بیگ اور کبھی شیخ عبداللہ کی طرف سے داغے جاتے، ان بیانات میں عوام کا ذہن پراگندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

پاکستان کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرف سے ہڑتال کی کال ناکام بنانے اور شیخ عبداللہ کو وزارت کی منتقلی کے دوران عوام کی طرف سے محاذ رائے شماری کے لیڈروں کے خلاف مظاہروں کو توڑ کرنے کے لیے چند مقامی اخباروں کو خریدا گیا اور ان کی طرف سے خبروں کے ذریعے یہ پروپیگنڈا کرایا گیا:

"شیخ صاحب کے بیشتر مطالبات تسلیم کر لیے گئے

صدر ریاست اور وزیر اعظم کے عہدے بحال ہو رہے ہیں۔ کشمیر کو داخلی خود مختاری دی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال ہو رہی ہے۔"

کشمیری عوام کو دھوکا اور فریب دینے کے لیے مجاہد منزل کے یہ PAID پریس نوٹ کارگر ثابت ہوئے۔

۵ر فروری کو محاذ رائے شماری کی مجلس عاملہ نے کشمیر سمجھوتہ کی توثیق کر دی اور ۲۱ر فروری کو لاڑکانہ میں وزیر اعظم پاکستان ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۸ر فروری ۱۹۷۵ء کو احتجاجی ہڑتال کرنے کی کال دے کر فرمایا:

"ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی معاہدہ کشمیری عوام سے ان کا حق، حقِ خود ارادیت چھین نہیں سکتا، یہ معاہدہ اہلِ کشمیر کو اپنے پیدائشی حق، حقِ خود ارادیت سے محروم نہیں کر سکتا، کشمیر کی موجودہ متنازعہ حیثیت ہندوستان اور پاکستان نے اقوام متحدہ کی منظور شدہ قراردادوں کے مطابق تسلیم کر لی ہے۔"

۲۲ر فروری ۱۹۷۵ء کو جموں میں سید میر قاسم نے گورنر کو اپنا استعفیٰ پیش کیا ۲۴ر فروری کو وزیر اعظم ہند مسز اندرا گاندھی نے معاہدہ دہلی یعنی اندرا عبداللہ ایکارڈ کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے فرمایا:-



(سید میر قاسم)

"ہند یونین اور ریاست جموں و کشمیر کے آئینی تعلقات بدستور دفعہ ۳۷۰ کے تحت قائم رہیں گے اور دونوں کے درمیان موجودہ تعلقات میں کوئی کمزوری نہیں آئے گی معاہدہ دہلی میں اس بات کی گنجائش رکھدی گئی ہے کہ اگر ریاستی حکومت ۱۹۵۳ء کے بعد نافذ شدہ متفقہ فہرست میں شامل بعض قوانین مثلاً سوشل ویلفیئر اقدامات، کلچر معاملات، سوشل سیکورٹی پروویجز قوانین اور اُن سے ملتے جلتے دوسرے قوانین تبدیل کرنا چاہتے تو مرکز اس پر ہمدردانہ

غور کرے گا، الیکشن کمیشن کے کنٹرول اور ریاستی گورنر کے اختیارات جیسے معاملات میں اس معاہدے میں اقرار گیا ہے کہ ریاستی آئین میں لائی گئی کوئی تبدیلی اسی صورت میں نافذ العمل ہو گی جب ایسے مسوّدۂ قانون پر صدر ہند منظوری دے کر دستخط ثبت کر دیں گے۔

مرکزی سرکار نے مرزا محمد افضل بیگ کی یہ تجویز مسترد کر دی کہ ریاست جموں و کشمیر پر سپریم کورٹ کا دائرۂ اختیار گھٹا دیا جائے، بنیادی حقوق سے متعلق دفعات کو ریاستی آئین کی طرف منتقل کیا جائے، ریاستی قانون کے انتخابات پر مرکزی الیکشن کمیشن کی نگرانی اور کنٹرول اٹھا یا جائے اور دفعہ ۳۵۶ میں ترمیم کر کے ریاست پر صدر راج نافذ کرنے سے پہلے ریاستی حکومت کی منظوری حاصل کرنا ضروری قرار دیا جائے۔

ہم نے ان میں سے کوئی بھی بات قبول نہیں کی۔ البتہ "وزیر اعظم" کا لقب اختیار کرنے میں ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے، اگر ریاستی قانون ساز یہ اپنے دستور میں اس نوعیت کی ترمیم پاس کرے لیکن وزیر اعظم کا لقب صرف جموں و کشمیر کی ریاست کے حدود کے اندر استعمال کرنے کی اجازت ہو گی۔ معاہدے میں یہ قول و فرار بھی موجود ہے کہ مرکز کے پاس ریاست میں قوم دشمن و علیحدگی پسند عناصر کی سرگرمیوں کی روک تھام کرنے کے لیے اختیارات بدستور موجود رہیں گے۔

بہر حال اندرا عبداللہ معاہدہ کے ذریعے نئی دہلی کے اس موقف کہ مملکت ہند و جموں کشمیر کے بارے میں اپنے اختیارات سے انحراف نہیں کرے گی، اور شیخ عبداللہ کے اس اصرار کے درمیان کہ اُسے اپنے پیروکاروں کے سامنے کچھ حاصل کرنے کے لائق رکھا جائے ایک راستہ دریافت کرنا ہی تھا۔ یہ معاہدہ اسی بات کی تکمیل کی غرض پوری کر رہا ہے، لیکن واضح کیا گیا ہے کہ ریاست اگست ۱۹۵۳ء کی پوزیشن پر واپس نہیں جا سکے گی۔ ہم نے کہدیا ہے کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف نہیں جاتی ہیں۔ البتہ ریاستی قانون ساز یہ کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ

ایسے قوانین پر نظر ثانی کرے جن کے بارے میں قانون سازیہ کے اختیارات مرکز اور ریاست دونوں کو حاصل ہیں۔ گورنر کے اختیارات و مراعات، الیکشن کمیشن کی حدِ اختیار اور الیکٹورل رولز کی ضابطہ بندی کے بارے میں ریاستی آئین میں ترمیم اس وقت تک موثر اور نافذ العمل نہیں ہو سکے گی، جب تک نہ صدر کی منظوری حاصل کی جائے، اس کو تسلیم کر لیا گیا ہے ایسا ریاست کے مفاد میں نہیں ہوگا۔

اسی طرح وہ ریاست کی طرف سپریم کورٹ کے دائرۂ اختیار کی توسیع کے بھی مخالف تھے اور ان میں انقلابی ترمیمات چاہتے تھے، یہ ناممکن دکھائی دیا۔

ریاست کے اندر آئینی مشنری کے ناکام ہونے کی صورت میں ریاست پر مرکز کی حکمرانی کا نفاذ عمل میں لانے کے لیے دفعہ ۳۵۶ شامل ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی۔

شیخ عبداللہ اس بات پر بھی اصرار کرتے رہے کہ جموں و کشمیر میں مملکت کے سربراہ اور انتظامیہ کے سربراہ کے لیے قبل ۱۹۵۳ء کی اصلاحات بحال کر دی جائیں لیکن یہ مانگ بھی تسلیم نہیں کی گئی، اس طرح ریاست کے سربراہ کا پرانا نام بھی بحال نہ ہوگا، اسے صدر ریاست کے نام سے نہیں بلکہ گورنر کے نام سے ہی پکارا جاتا رہے گا، اس طرح انتظامی سربراہ کے نام میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔"

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی طرف سے معاہدۂ دہلی کی پارلیمنٹ اور پھر راجیہ سبھا میں وضاحت کے دوران شیخ عبداللہ نے اپنی طرف سے ایک بیان جاری کیا۔

"قانونی اور آئینی انتظامات بنیادی افہام و تفہیم کے اظہار کا ایک ذریعہ ہیں، مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا آزاد اور خان عبدالغفار خاں کے ساتھ میں نے جو کام کیا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ اسی مشترکہ اصولوں پر ایمان

کا نتیجہ ہے کہ جس نے ہمیں ہند یونین کے ساتھ شامل ہونے میں رہبری کی اور اُن کے ایک خادم کی حیثیت سے میں نے الحاق کی تصدیق کی، بعد میں بھارتی دستور ساز اسمبلی کے ایک رُکن کی حیثیت سے میں نے ہندوستانی آئین کے بنانے میں اپنی خدمات ادا کیں اور میں بھی آئین پر دستخط کرنے والوں میں شامل تھا۔

۱۹۵۳ء کی میری معزولی اور نظر بندی کے بعد مذاکرات کا آغاز پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا۔ بدقسمتی سے ان کی موت نے اس میں رکاوٹ ڈالی، مجھے ایکبار پھر بلکہ بھرپور طریقے پر ملک اور ریاست کی سیاسی زندگی میں شامل کرنے کا سہرا پنڈت نہرو کی صاحبزادی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سر ہے۔

میں نے انہیں بتا دیا کہ میری خدمات ہندوستان کے لیے وقف ہیں اور میری ۱۹۵۳ء کی پوزیشن بحال کر دی جائے تو میں بہتر طور پر کام کر سکتا ہوں لیکن مسز اندرا گاندھی نے مجھ پر وہ مشکلات واضح کر دیں جو گھڑی کی سوئیاں پیچھے کی طرف موڑنے سے پیدا ہوں گی، ہمیں حقیقت پسندی کے ساتھ وہ سب تبدیلیاں زیرِ نظر رکھنا ہوں گی۔

وزیر اعظم کے ساتھ مذاکرات کے اختتام پر جو خوشگوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اُس کی بدولت وہ بدلا ہوا منظر سامنے آتا ہے جس میں پارٹی کا نصب العین حاصل کرنے کے لیے رائے شماری کا راستہ بے محل اور غیر متعلقہ بن گیا ہے۔

ہماری پارٹی کو امتیازات سے بالاتر رہ کر ریاست کی سیکولر اور جمہوری قوتوں کی تنظیم نو کرنے کی کوشش میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔"

دوسرے الفاظ میں شیخ محمد عبداللہ نے آخر پر یہ بتایا کہ ۲۲ سال تک ہم نے "رائے شماری" کا جو راستہ اختیار کر رکھا تھا وہ راستہ ہم نے چھوڑ دیا لیکن اگر کسی نے یہ راستہ اپنایا تو اس کو ہم کچل کر رکھ دیں گے۔ ہم کسی کو بھی یہاں "رائے شماری" کا نام لینے کا اختیار نہیں دیں گے۔ یہ منافع بخش دوکان اب ہم نے بند کر دی اس دوکان

سے ہمیں صرف دولت مل گئی، جاہ وحشمت نہیں۔ چونکہ ہمیں جاہ وحشمت کی بھی ضرورت ہے لہٰذا کوئی اس میں خلل ڈالنے کی کوشش نہ کرے، جو کوئی ایسا کرے گا وہ پاکستانی ہوگا اور ایسے پاکستانی کے ساتھ سختی سے نپٹ لیا جائے گا۔

کشمیر سمجھوتہ پر دستخط کرنے کے دوران اندرا عبداللہ کے درمیان دفعہ ۳۷۰ اور ایکارڈ کو کسی وقت تک کے لیے پوشیدہ رکھنے کا بھی ایک سمجھوتہ ہوا تھا، چونکہ اس سمجھوتہ پر دستخط نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ دونوں کے درمیان زبانی طے پایا تھا، لیکن ہندوستانی عوام کو اپنی فتح اور اپوزیشن کو اپنے بڑے کارنامے سے واقف کرانے کے لیے مسز اندرا گاندھی اتاؤلی ثابت ہوئیں۔ انھوں نے پارلیمنٹ کے بعد راجیہ سبھا میں جاکر جب کشمیر کے لیڈران قوم کے ایمان، اصول اور ان کے موقف کا بھانڈا پھوڑ دیا تو شیخ عبداللہ مسز اندرا گاندھی کی اس حرکت پر ناراض ہوگئے اور انہوں نے حلف کی کاروائی میں شامل ہونے سے انکار کردیا، کیونکہ ان کے عقیدت مند شرمسار تھے عوام دم بخود تھے خود ان کا قد بہت گھٹ گیا تھا۔

شیخ عبداللہ کی یہ گھڑی ایک امتحان سے کچھ کم نہ تھی۔ انھوں نے ۲۲ سال کی جدوجہد آزادی کو اقتدار کی بھینٹ چڑھا کر ایک سمجھوتہ کیا تو مسز اندرا گاندھی سے ۲۲ منٹ تک بھی اسے پوشیدہ نہ رکھوا سکے۔ اس موقع پر شیخ عبداللہ کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوگیا کہ مسز اندرا گاندھی دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں ان سے کیا گیا عہد آشکارا نہ کریں۔ کیونکہ جو ایکارڈ کا راز پوشیدہ نہ رکھ سکی، وہ دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں کہاں خاموش رہے گی۔

یاد رہے اقتدار کی منتقلی کی بات چیت کے دوران شیخ محمد عبداللہ نے مسز اندرا گاندھی سے کہا تھا ـــــ آپ نے مجھ پر بھروسہ کرکے مجھے دوبارہ ریاست کا حکمران بنا دیا، میں آپ کے اس بھروسے کی کسوٹی پر کھرا اترنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مستقبل قریب میں دکھاؤں گا جس پر آپ نے اتنا بڑا بھروسہ کیا وہ دفعہ ۳۷۰ ختم کرکے ہندوستان اور کشمیر کا رشتہ مضبوط کرکے دے گا۔"

(دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں شیخ صاحب کی اس یقین دہانی کا اعتراف مسز اندرا گاندھی نے کیا ہے، اس کی تفصیل اگلے باب میں آئے گی)

"چونکہ دوران گفتگو دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں شیخ عبداللہ یہ یقین دہانی کرا چکے تھے اس لیے

انھیں خدشہ ہوا۔ ہو نہ ہو ایکارڈ کی تفصیلات کے بعد وہ اس کا انکشاف نہ کر بیٹھے؟ شیخ صاحب شش و پنج میں پڑ گئے۔ وہ آگے جانا چاہتے تھے تو آگے کھائی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے تو پیچھے چاہ (کنواں) تھا۔ وہ درمیان میں کچھ دیر تک لٹکے رہے۔

جب گورنر ہاؤس جموں سے مسز اندرا گاندھی کو ہاٹ لائن پر بتا دیا گیا کہ شیخ صاحب آپ کے پارلیمنٹ میں بیان پر روٹھ گئے ہیں اور وہ حلف کی کاروائی میں شامل نہیں ہو رہے ہیں تو انہوں نے غصّہ ہوکر ٹیلیفون پر گورنر ایل کے جھا کو بتایا:-

"میر قاسم کو کہا جائے کہ وہ CONTINUE کریں۔ اور نیڈوز[1] ہوٹل کے بارے میں جو میں نے ہدایات دیں۔ اس پر عمل کریں۔"



(گورنر ایل کے جھا)

نوٹ:- نیڈوز ہوٹل کا چالیس سالہ لیز اسی دہائی میں ختم ہو رہا تھا۔ اور مدّت میعاد سے چند سال قبل اس ہوٹل کو گورنمنٹ نے نیلام پر چڑھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسز اندرا گاندھی نے ایسا کرنے کی منظوری دی تھی، بشرطیکہ شیخ صاحب ایکارڈ میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالیں ـــــ مرکزی سرکار کے ساتھ ریاستی سرکار اس بات سے بخوبی واقف تھی کہ نیڈوز ہوٹل سے جو منافع خوری کی نہر نکلتی ہے وہ سیدھی شیر کشمیر ہاؤس تک جاتی ہے۔ شیخ خاندان اس ہوٹل کا سالانہ ہزاروں روپے کا معاوضہ گورنمنٹ کو ادا کرتی ہے اور لاکھوں روپے سالانہ بطور کرایہ وصول کرتی ہے۔

---

[1] نیڈوز ہوٹل کے نام پر کشمیر ایکارڈ کے دوران مرکزی سرکار کی طرف سے شیخ محمد عبداللہ کو بلیک میل کیا گیا، یہ بات طے پا چکی تھی اگر شیخ صاحب مسز اندرا گاندھی کی مرضی کے ایکارڈ پر دستخط نہیں کریں گے تو نیڈوز ہوٹل ان سے چھین لیا جائے گا۔

گورنر ایل، کے، جھا سے مسز اندرا گاندھی کا آڈر سن کر سید میر قاسم نے شیخ صاحب کو حلف کی کارروائی میں شامل ہونے کا مشورہ دے کر ایک بہت بڑی قربانی دی۔ انھوں نے واقعی اس وقت اقتدار کو تیاگ دیا جب وہ ان کے قدموں میں تھا۔ میر قاسم نے اپنی کھوئی ہوئی وزارت جو اب بھی اُن کے قدم چُوم رہی تھی، شیخ صاحب کے حوالے کر کے بڑی فراخدلی دکھائی۔ شیخ صاحب نے سید میر قاسم کا مشورہ قبول کر کے کھائی کو پار کر لیا۔ اور حلف برداری کے بعد اخباری نمائندوں کے سامنے اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔



اندرا گاندھی

"معاہدے کی اشاعت اور اس کی کچھ تشریحات غلط اور بے محل ہیں میں معاہدے کے حقایق بہت جلد عوام کے سامنے رکھوں گا۔ معاہدے کے دوران جو میرے اور مسز اندرا گاندھی کے درمیان خط و کتابت ہوئی اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے۔"

اس موقع پر شیخ صاحب نے خطوط کا جو ذکر کیا وہ شاید ایک معرکہ تھا جو انھوں نے سر کر لیا تھا۔ "کشمیر ایکارڈ" کے نام سے جو قلعہ شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ نے فتح کر لیا تھا۔ اس قلعہ کو کانگریس پارٹی نے اس وقت مسمار کر دیا جب انہوں نے شیخ عبداللہ کو نیچا دکھانے کے لیے اس ایکارڈ کی ہزاروں کاپیاں چھاپ دیں۔ کیونکہ یہ دستاویزات خود شیخ صاحب کے تمام زبانی جمع خرچ کا مُسکت جواب تھیں۔

شیخ صاحب اس بے خطا ہتھیار سے اس قدر سہم گئے کہ انھوں نے کانگریس کے صدر شری دیوکانت بروا کے پاس دُہائی دی، جنہوں نے اپنی خسروانہ عنایت سے پردیش کانگریس سے سفارش کر دی کہ شیخ صاحب اور بیگ صاحب جیسے بزرگوں کی نمایاں خدمات کا لحاظ کر کے انہیں اس آزمائش سے نجات دلائی جائے، چنانچہ ان کتابچوں کی تقسیم روک کر ان رہنماؤں کو وسیع پیمانے پر شرمندگی کا سامنا کرنے سے محفوظ بنا دیا گیا۔

شیخ صاحب نے ان خطوط کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گویا محاذِ جنگ میں انھوں

نے اپنی فتح کا جھنڈا گاڑ دیا تھا۔ اور جس کا ذکر مسز اندرا گاندھی نے شاید جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔

خطوط حسبِ ذیل ہیں:۔

" ۳ کوٹلہ لین
نئی دہلی ۱۱ فروری ۱۹۷۵ء
محترمہ پردھان منتری

میں نے ریاست جموں و کشمیر اور انڈین یونین کے درمیان مرکز اور ریاست کے تعلقات سے متعلق آئینی امور کے بارے میں ان نتائج کے متن کو دیکھا ہے جن پر شری پارتھا سارتھی اور مرزا افضل بیگ متفق ہوئے ہیں میں نے اس دستاویز کا مطالعہ کیا ہے اور آپ کے ساتھ تبادلہ خیال بھی کیا ہے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے میرا یہ خیال ہے کہ مرکز اور ریاست جموں و کشمیر کے بیچ وہی آئینی رشتہ ہونا چاہیے جو ۱۹۵۳ء میں تھا۔ پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ یہ متفقہ نتیجے سیاسی سطح پر میرے تعاون اور مرکز اور ریاست کے تعلقات کے لیے ایک اچھی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ بات چیت کا بڑا مقصد دونوں طرف کی غلط فہمی کو دُور کرنا اور اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ مرکز اور ریاست کے بیچ کی کڑی کو زیادہ مضبوط بنایا جائے اور ریاست کے لوگوں کو سماجی بہبود اور ترقی کے کام کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔

ریاست جموں و کشمیر کا بھارت سے الحاق بحث کا موضوع نہیں ہے میرا یہ پختہ یقین ہے کہ جموں و کشمیر کا مستقبل بھارت کے ساتھ ہے، کیونکہ دونوں کے نظریئے مشترکہ ہیں مجھے امید ہے کہ آپ اس بات کو سمجھتی ہیں کہ سیاسی اور سرکاری سطح پر میرے تعاون کرنے کی واحد وجہ یہ ہے کہ ریاستی سرکار ریاست کے لوگوں کی بھلائی کے کام شروع کر سکے جسے میں نے ہمیشہ اپنا متبرک فرض سمجھا ہے میری یہ لگاتار کوشش ہو گی کہ ریاست جموں و کشمیر ملک کی خود مختاری یک جہتی اور ترقی میں

اپنا پارٹ ادا کرتی رہے اسی طرح مجھے یہ یقین ہے کہ مرکزی سرکار ریاست کے بھارت کا ایک اٹوٹ جزو ہونے کی حیثیت سے ریاست کے لوگوں کی بھلائی کے کام کو فروغ دینے میں ریاستی سرکار کی طرف سے اُٹھائے گئے اقدامات میں پورا تعاون دے گی۔



ملک ایک نازک دور سے گزر رہا ہے اور ہم سب کے لیے جو جمہوریت، سیکولرزم اور سوشلزم کے آدرشوں میں یقین رکھتے ہیں یہ اور بھی ضروری ہے کہ قوم کا رہنما ہونے کی حیثیت میں ہم آپ کے ہاتھوں کو اور بھی مضبوط کریں اور اس اسپرٹ سے میں اپنا پورا تعاون پیش کرتا ہوں۔

آپ کا مخلص:

(دستخط) ایس۔ ایم، عبداللہ

شیخ عبداللہ کو مسز اندرا گاندھی کا جوابی خط

نئی دہلی

۱۲ر فروری ۱۹۷۵ء

مجھے آپ کا خط پاکر خوشی ہوئی جس میں آپ نے مرکز کے ساتھ جموں وکشمیر کے تعلقات کے کچھ آئینی پہلوؤں پر مرزا محمد افضل بیگ اور شری پارتھا سارتھی کی بات چیت کے نتائج پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا ہے اور جموں وکشمیر کے لوگوں کی مزید بھلائی کے لیے سیاسی اور سرکاری سطح پر اپنا پورا تعاون پیش کیا ہے، میں ریاست جموں وکشمیر کے بارے میں مرکز اور ریاست کے تعلقات پر آپ کے خیالات سے آگاہ ہوں میں پہلے بھی آپ پر یہ بات واضح کرچکی ہوں کہ گھڑی کی سوئیاں پیچھے نہیں گھمائی جا سکتیں اور ہمیں حالات کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے، جس اسپرٹ سے آپ نے متفقہ نتیجوں پر غور کیا ہے اور میں آپ کو یہ اطلاع دینے کی پوزیشن میں ہوں کہ

انہیں لاگو کرنے کے لیے ضروری ایگزیکٹیو کارروائی کی جائے گی۔ میں نے ریاست کے وزیر اعلیٰ سے بھی اس معاملے میں پورا رابطہ قائم کر رکھا ہے۔ اور وہ آپ کے ساتھ سیاسی تعاون کرنے اور ریاست کے ساتھ انڈین یونین کے تعلقات کے بارے میں سمجھوتہ کی کارروائی سے اتفاق رکھتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ مرکزی سرکار جموں وکشمیر کے لوگوں کی ترقی اور بھلائی کے کاموں کو بڑھاوا دینے کے لیے ریاستی سرکار کی طرف سے اٹھائے جانے والے تمام اقدامات میں پورا تعاون دیتی رہے گی۔ مرکزی سرکار کو بھی ایسے اقدامات سے برابر کی دلچسپی ہے۔



جیسا کہ آپ نے کہا ہے ملک ایک نازک دور سے گزر رہا ہے اور میرے لیے یہ اطمینان کی بات ہے کہ آپ ایسی اہم شخصیت جس نے آزادی کی جدوجہد میں اہم پارٹ ادا کیا ہے وہ ملک کو مضبوط بنانے اور اس کے آدرشوں کو قائم رکھنے کے لیے ایک بار پھر آگے آئے۔"

آپ کی مخلص:

(دستخط) اندرا گاندھی

اس قسم کے درجن بھر خطوط اور جوابی خطوط جن کا شیخ صاحب نے بڑی ڈھٹائی سے اظہار کیا تھا۔ اگر ان کے بارے میں یہ کہا جائے کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا تو غلط نہیں ہوگا۔ پوچھا جا سکتا ہے۔

آپ نے بائیس سال تک "رائے شماری"، "حقِ خودارادیت"، اور "آزادی" کے نام پر سینکڑوں آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتروا دیا۔ سینکڑوں بچوں کو یتیم کروا دیا، درجنوں عورتوں کو بیوہ بنوا دیا۔ ہزاروں لوگوں کو سزائیں دلوائیں بے شمار لوگوں کو زخمی کروا دیا، اس کے بعد ایک وہ اقتدار حاصل کیا جس کے بارے میں آپ نے ۹ر اگست ۱۹۶۶ء کو کہا تھا:-

"جس شخص کو حکومت ہند کا اعتماد حاصل ہو وہی کشمیر کا چیف منسٹر

بن سکتا ہے، چیف منسٹر اور پرائم منسٹر بجائے خود کوئی مقصد نہیں مسائل عہدے قبول کرنے سے حل نہیں ہوتے... میں نے کشمیری قوم سے کچھ وعدے کیے ہیں جن کو مجھے پورا کرنا ہے۔ کشمیر کا چیف منسٹر وہی بن سکتا ہے جو الحاق کو اٹوٹ مانے گا اور میرا موقف یہ ہے کہ ہم نے بھارت کے ساتھ عارضی الحاق کیا ہے اور یہ الحاق تابع رائے شماری ہے۔ میں رائے شماری کے مطالبے سے دست بردار ہو کر قوم سے غدّاری نہیں کر سکتا۔ جو ایسا کر چکے وہ اس کی سزا پائیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں عوام میں ان کی کوئی ساکھ نہیں ہے، اور وہ اپنے کرتوت پر پچھتا رہے ہیں۔"

عہدۂ وزارت کے بارے میں یہ شیخ عبداللہ کے وہ خیالات تھے جو انہوں نے ایکبار نہیں، بلکہ ۲۲ سالہ سیاسی زندگی میں بار بار دہرائے آج وہ سب کچھ بھول کر بھارت کے ساتھ ایک معاہدہ کر چکے اور اس معاہدے کے بارے میں انھوں نے ۹ اگست ۱۹۷۵ء کو مجاہد منزل کے ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا تھا:۔

"..... ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو بھارت نے ہماری وزارت پر شب خون مارا۔ اس کاروائی سے بھارت نہ صرف ہمارے بلکہ دُنیا کے سامنے ننگا ہو گیا کیونکہ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اس نے دُنیا کے سامنے کچھ وعدے کیے تھے۔ ۹ اگست کے واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملا ہے کہ بڑی طاقت اور چھوٹی طاقت۔ طاقتور انسان اور کمزور انسان کے درمیان جو عہد و پیمان یا معاہدہ طے پاتا ہے وہ قائم نہیں رہتا۔ ہم نے ہندوستان کے ساتھ جو معاہدے طے کیے تھے۔ اندازے کی غلطی کی وجہ سے کیے تھے۔ ۹ اگست کے واقعہ نے یہ بات ثابت کر دی کہ دو غیر متوازن جماعتوں جن میں ایک طاقتور اور دوسرا کمزور ہو کوئی معاہدہ قائم نہیں رہ سکتا۔ پنڈت نہرو نے ہم سے ایک وعدہ کیا تھا اور بین الاقوامی اداروں میں اس وعدے کو دُہرایا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ طاقت اور دولت کے بل بُوتے پر وعدے سے انحراف کریں گے۔

بہر حال ہماری آنکھیں کھُل گئی ہیں اور ہمیں ایک تجربہ بھی حاصل

ہو چکا ہے، آئندہ ہم اس قسم کی غلطی کو نہیں دُہرائیں گے۔"

شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۵۳ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک مسئلہ کشمیر کی آڑ میں رائے شماری، حقِ خود ارادیت، اور 'آزادی' کے جو بلند بانگ دعوے کیے، اور ان کے لیے اپنے ایمان اصول اور ضمیر کی جو دہائی دی شاید دُنیا کی کسی سیاسی تاریخ میں ہمیں اس کی مثال نہیں ملے گی سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ان کا ثانی نہیں ملے گا جنہوں نے اقتدار کے لیے ۲۲ سالہ جد و جہد کو بھول کر اس طرح ذلّت آمیز سمجھوتہ کیا ہو، جس سمجھوتہ کو سننے کی انھوں نے خود تاب نہ لائی اور انہیں حلف کی کاروائی کے دوران کچھ دیر کے لیے ہی سہی رُکنا پڑا۔

شیخ محمد عبداللہ کے دست راست مرزا محمد افضل بیگ جو "محاذ رائے شماری" کے بانی اور صدر رہے تھے، جو پاکستان کی دہائی دے کر ہندوستان کو قطعاً مسترد کر کے کشمیری عوام کو راولپنڈی روڈ دکھا رہے تھے۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھ کر بولنے لگے:۔

"برصغیر کے مجموعی حالات بدلنے سے ہم نے رائے شماری کا نعرہ ترک کرنے میں ہی ریاست جموں و کشمیر کے ساٹھ لاکھ لوگوں کی عافیت سمجھی، کشمیر میں پاکستان کہنے والے کشمیر اور پاکستان دونوں کے دشمن ہیں۔ میں ریاست جمّوں و کشمیر کے لوگوں پر زور دیتا ہوں کہ وہ قومی دھارے میں داخل ہو کر شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھ مضبوط کریں۔

شیخ عبداللہ کی سربراہی میں کشمیر کا الحاق ہندوستان کے ساتھ بہت پہلے ہو چکا ہے ـــــ ہمیں محسوس ہو رہا ہے، ہم نے ۲۲ سال کا طویل عرصہ ضایع کر دیا۔ اور اسے آوارہ گردی میں گزارا۔"

اس سمجھوتے کے خلاف ریاستی عوام نے ۲۸ فروری ۱۹۷۵ء کو جو ہڑتال کر کے دن کو رات بنا دیا یہ یقیناً عوام کی طرف سے سمجھوتہ مسترد کیے جانے کا فتویٰ تھا۔ لیکن ۲ مارچ کو جب شیخ محمد عبداللہ کا بحیثیتِ وزیر اعلیٰ سرینگر میں استقبال کیا گیا اس نے یقیناً اِس سمجھوتہ پر مُہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

کشمیری عوام نے کشمیر ایکارڈ کو مسترد کیا یا اُسے منظور کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اُن لوگوں کے پاس بھی نہیں جنھوں نے ہڑتال میں بھرپور حصّہ لینے کے بعد استقبال میں بھی حصّہ لیا۔ کشمیری عوام کا یہ تضاد انکی بے غیرتی اور بے شعوری کا کھُلم کھُلا اظہار تھا۔ جس کا انھوں نے بار بار اعادہ کیا ہے۔



اوپر :۔ شیخ صاحب مسز اندرا گاندھی کی طرف سے کشمیر ایکارڈ کی تفصیل بتانے سے ناراض ہیں۔

نیچے :۔ گورنر ایل، کے جھا انہیں عہدے اور رازداری کا حلف دلا رہے ہیں۔



سیّد میر قاسم کی کرسی پانے کے لئے

"کبھی خم نہ ہو گی میری گردن" کہنے والے گردن کے ساتھ کمر کو خم دے رہے ہیں



کشمیر ایکارڈ کی بنیاد پر دوبارہ اقتدار کی مسند سنبھالنے کے بعد کابینہ — موجود وزراء، مرزا محمد افضل بیگ
شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد

شکوہ نہیں یہ سادہ دلی کا ہے تجربہ
ہوتا ہے دشمنی سے سوا دوستی کا زہر

وزارت کی تشکیل اور ضمنی انتخابات

محاذِ رائے شماری کا کفن دفن

وزیر اعلیٰ کا عہدہ سنبھال کر شیخ صاحب نے کابینہ میں اپنے علاوہ مرزا محمد افضل بیگ دیوی داس ٹھاکر اور صوفی نرہو کو لیا، کابینہ میں کسی کانگریسی وزیر کو نہ لے کر ایک طرح سے شیخ عبداللہ نے پردیش کانگریس کی دشمنی مول لے لی۔

'کشمیر ایکارڈ' کے تحت جب شیخ صاحب دوبارہ برسر اقتدار آ گئے، تو وزیر اعظم کے بجائے انھوں نے وزیر اعلیٰ کے عہدے کو غنیمت جان کر اسی پر قناعت کرنا مان لیا۔

پچھلے ۲۲ برسوں میں شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ کی 'آزادی، حق خود ارادیت اور رائے شماری' پر کتنا خون خرابہ ہوا، کتنے لوگ مر گئے اور کتنے گھر اجڑ گئے۔ تاریخ جب کبھی اس کو دُہرائے گی تو سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ ہمارے لیڈران قوم اور محاذ رائے شماری کے ساتھ وابستہ دیگر عہدیداروں اور نامزد کارکنوں نے اِن بائیس برسوں کا معاوضہ اٹھاون لاکھ باسٹھ ہزار اور سات سو روپے خزانۂ عامرہ سے وصول کر کے حاصل کر لیے اور جو لوگ ان بائیس برسوں میں مر گئے۔ وہ عورتیں جن کا سہاگ اُجڑ گیا اور وہ بچے جو اس دوران یتیم ہو گئے ان کو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملی، حالانکہ پاکستان سے آئے ہوئے ۵ کروڑ جن کا حکومت پاکستان کے ترجمان نے وہائٹ پیپر میں ذکر کیا ہے اور جس پر اُن مصیبت زدہ لوگوں کا حق بنتا تھا۔ محاذ کے لیڈروں نے انہیں اس حق سے بھی محروم کر دیا۔

سب سے بڑی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ محاذِ رائے شماری کے ساتھ وابستہ لیڈر اور عہدیدار جو ہندوستان کے خلاف کشمیر کی آزادی کے لیے لڑے اور جیل گئے وہ وزارت ملتے ہی ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑنے کا معاوضہ فریڈم فائٹر کے نام سے وصول کرنے لگے۔

۲۹ جنوری ۱۹۶۵ء کی وہ تقریر جو یومِ احتجاج کے سلسلے میں مجاہد منزل میں محاذِ رائے شماری کے عہدیداروں اور ورکروں کے سامنے قائد کارواں نے کی، آج بھی 'محاذِ رائے شماری' کے کتابچے میں اس طرح محفوظ ہے:

"..... جو لوگ قومی مفاد کے خلاف کام کرتے ہوں اور ہماری آزادی کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کے پاس جا کر ان کو اخلاق اور دلائل سے سمجھاؤ کہ وہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں جس سے نہ صرف وہ اپنے لیے نقصان کا باعث بن رہے ہیں۔ بلکہ اپنے اہل وعیال اور ساری قوم کے لیے باعثِ عذاب بن رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ اب بھی وقت ہے باز آؤ اور محاذ کے جھنڈے تلے جمع ہو جاؤ جو اس جدوجہد کا نشان ہے جس کا مقصد کشمیری قوم کو آزاد کروانا ہے، ان سے کہو کہ تمہاری ماضی کی غلطیاں معاف کی جائیں گی، اگر تم اپنی حرکات سے باز آجاؤ گے....."

کشمیر کو ہندوستان سے آزادی دلانے والی قائد قوم کی یہ تقریر کتابچے کی صورت میں عوام کے پاس پہنچانے والے وہ صدرالدین مجاہد ہیں، جو آج فریڈم فائٹر ایسوسی ایشن کے صدر ہیں اور آئے دن فریڈم فائٹر کا معاوضہ بڑھانے کا حکومت ہند سے مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔

بائیس ۲۲ سال تک ہندوستان کے خلاف لڑنے کے بعد ملک کی آزادی کا معاوضہ وصول کر کے محاذ رائے شماری کے لیڈروں اور عہدیداروں نے غیرت شرم، اخلاق وآداب کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ایمان اور ضمیر کی بھی کوئی پروا نہیں کی نہ کر رہے ہیں۔

بائیس ۲۲ سال تک ہندوستان کے ساتھ لڑ کر ۲۲ سال کے بعد ہندوستانی ہونے کا ثبوت انھوں نے ۲۲ سال کا معاوضہ وصول کر کے دیا، اور یہ معاوضہ مختلف مدوں سے ایسا وصول کیا جیسے کہ یہ جنم جنم کے بھوکے تھے۔ دولت وصول کرنے کے معاملے میں یہ لوگ ایسے ہاتھ پاؤں

مارنے لگے گویا صحرانوردی کرتے ہوئے اچانک راستے میں انہیں خزانہ مل گیا تھا۔

۲۲ برسوں کی اس جدوجہد جس میں کئی قومیں آزاد ہو گئیں اور دنیا کے نقشے میں کئی تبدیلیاں آگئیں ہمارے لیڈران قوم نے اس ساری جدوجہد کو آوارہ گردی سے تعبیر کر کے کشمیری قوم کے ساتھ ایسا مذاق کیا جس کی ساری دنیا میں کہیں کوئی مثال نہیں ملتی اور جب تک یہ دنیا قائم ہے اس قسم کا مذاق شاید ہی کوئی رہنما اپنی قوم سے کر سکے گا، اور شاید ہی کوئی قوم اس قسم کا مذاق قبول کرے گی۔

حق تو یہ ہے کہ اس قسم کا مذاق غیر مہذب لوگ بھی برداشت نہیں کر سکتے مہذب لوگوں کی تو بات ہی نہیں۔

دنیا میں آج بھی کئی ممالک ایسے ہیں جہاں کے لوگ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہیں۔ وہ آج بھی ننگے ہیں، جانوروں کی کھالیں اوڑھتے ہیں، غاروں میں رہتے ہیں اور جنگلی جانوروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں، ایسے لوگ مختلف قبیلوں میں بٹے ہوئے اپنے سردار کے ماتحت نظامِ حیات چلا رہے ہیں۔ ان جنگلی لوگوں کے ساتھ ان کا سردار اگر اس قسم کا مذاق کرے تو کیا وہ سردار اُن پر حکمرانی کر سکے گا؟



(مولوی یوسف شاہ۔ فاروق)

نہیں — ہرگز نہیں —!

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کشمیری عوام نے ایسا کیوں کیا —؟

میں نے جب اس سوال پر غور کیا تو مجھے یہ جواب ملا کہ ہم تو جنگلی انسان بھی نہیں بلکہ بھیڑ اور بکریاں ہیں، ان بھیڑ بکریوں پر حقِ ملکیت جتا کر شیخ خاندان اور مولوی خاندان آپس میں کبھی لڑ پڑے تو اس لڑائی میں بے شمار بھیڑیں اور بکریاں ذبح ہو گئیں، آخر ایک سمجھوتے کے تحت بھیڑیں شیخ خاندان کے حصے میں آگئیں اور بکریاں مولوی خاندان کو "پٹے" پر دیدی گئیں۔



شیخ عبداللہ۔ شیخ فاروق

۱۹۳۱ء سے جب سے ان بھیڑوں اور بکریوں کا بٹوارہ ہوا یہ دونوں اپنے اپنے ریوڑ کو جہاں چاہتے ہیں لے جاتے ہیں جب چاہتے ہیں ان کو آپس میں لڑاتے ہیں یہ دونوں خاندان ضرورت کے وقت نہ صرف انہیں بیچ کھاتے ہیں بلکہ ان کا خون بھی چوستے ہیں اور ان سے اُون بھی لیتے ہیں، اگر یہ کچھ گڑبڑ کریں تو ان کی کھال بھی کھینچ لیتے ہیں۔

شیخ خاندان اور مولوی خاندان نے کشمیری عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر ان کا جو استحصال کیا اس کی مکمل تفصیل کے بیان کے لیے الگ کتاب کی ضرورت ہے۔

کشمیری عوام کو "محاذ رائے شماری" کے جھنڈے تلے جمع ہو کر ہندو سنتان سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بلند بانگ دعوے کرنے والے جب دوبارہ اقتدار حاصل کر چکے تو اس محاذ رائے شماری کا وجود ان قومی رہنماؤں کو بُری طرح کھٹکنے لگا۔

چنانچہ ۵ رجولائی ۱۹۷۵ء کو مجاہد منزل میں جنرل کونسل کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ محاذ رائے شماری کے صدر نے بدلے ہوئے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جب محاذ رائے شماری کو ہمیشہ کے لیے سپرد خاک کرنے کی تجویز پیش کی تو مجاہد منزل میں ایک عجیب صورت حال پیدا ہو گئی۔ جہاں کئی ممبران نے ایسا سُن کر خاموشی اختیار کر لی، وہاں کئی ممبروں نے زور دار الفاظ میں اس تجویز کی مخالفت کی، کئی ممبران جذباتی ہو کر واویلا کرنے لگے۔ کئی ممبران کو محاذ رائے شماری کی لاش پر روتے ہوئے دیکھا گیا۔

صوفی محمد اکبر جو محاذ رائے شماری کی اس تجہیز و تدفین میں شامل نہیں تھے انھوں نے ایک خط کے ذریعے محاذ کے صدر سے کہا تھا۔

"یہ کارروائی ۹ اگست کے شہیدوں کے ساتھ صاف غدّاری ہے
کل جب اس دُنیا سے جانا پڑے گا۔ ان شہیدوں کو اپنا مُنہ کیسے دکھاؤ گے؟"

مجاہد منزل کی نشست میں عبدالرشید شاہ نے آنسو بہاتے ہوئے کہا:

"جب ہم خدا کے سامنے حاضر ہوں گے تو اُنھیں کیا جواب دیں گے؟"

اجتماع میں غلام نبی ہاگرو نے کہا۔

"ہم سینکڑوں شہیدوں کو کیسے مطمئن کریں گے۔
کیا ہماری ساری جدوجہد کا ماحصل صرف ایک کرسی تھی؟
اور وہ بھی میر قاسم کی جھوٹی کرسی جسے محاذ رائے شماری کے "کوڈورڈ" میں

"کلینہ نام رکھا گیا تھا"

اس شور و شرابہ ان آہوں اور کراہوں سے لاپرواہ ہو کر مرزا محمد افضل بیگ نے فرمایا:

"یہ شیخ صاحب کا فرمان ہے اور اسے آپ کو قبول کرنا ہے۔ جو اسے قبول نہیں کرے گا تنظیم میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

محاذ رائے شماری کا کفن دفن کرنے کے چند روز بعد صوفی محمد اکبر سرینگر آئے تو مجاہد منزل سے اپنا بوریہ بستر باندھ کر ہمیشہ کے لیے اس مجاہد منزل کو خیرباد کہہ کر روانہ ہو گئے۔ جس مجاہد منزل میں انھوں نے رہنمایانِ قوم کے ساتھ قوم سے کچھ وعدے کئے تھے۔ غلام نبی ہاگرو نے اس تنظیم کو خیرباد کہہ دیا جسکے لیے انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی تھیں صوفی محمد اکبر مجاہد منزل سے جب بوریا بستر لے کر باہر آئے تو اپنے آبائی گھر سوپور جانے کے لیے انھوں نے "مرحوم محاذ رائے شماری" کی جیپ گاڑی میں سوار ہونا قبول نہیں کیا بلکہ وہ ایک ٹیکسی لے کر بس اڈے تک گئے اور پھر سوپور روانہ ہو گئے، صوفی صاحب نے مرتے دم تک مڑ کر اس مجاہد منزل کی طرف نہیں دیکھا۔ جو ان کی نظر میں کھنڈر بن گئی تھی۔

کشمیر کی جدوجہد آزادی میں کئی کردار آئے اور گئے لیکن اس میں صوفی محمد اکبر واحد شخصیت کے مالک تھے، جنہوں نے ۱۹۷۵ء کے دلی ایکارڈ پر شیخ محمد عبداللہ اور مرزا محمد افضل بیگ پر اقتدار کے عوض کشمیری قوم کی آزادی کا سودا کرنے کا الزام لگایا اور ان سے علیحدہ ہو کر 'مسئلہ کشمیر' کو زندہ رکھنے کے لیے 'محاذ آزادی' کی بنیاد ڈالی صوفی محمد اکبر نے ریاست کی شمع آزادی کو فروزاں رکھنے میں ایک ناقابل فراموش کردار ادا کیا، ایک مثالی کردار پیش کیا، لیکن سوائے اعظم انقلابی کے اور کسی نے ان کا ساتھ نہ دیا۔

صوفی محمد اکبر سے فریڈم فائٹرز وظیفہ لینے کو کہا گیا تو انھوں نے کہا کیسی جدوجہد اور کہاں ہے آزادی جس کا آپ مجھے وظیفہ دے رہے ہیں؟

لین دین کے معاملے میں صوفی صاحب دیگر لیڈروں کے مقابلے میں بالکل پاک و صاف رہے، انہوں نے کبھی روپے پیسے کا لالچ نہیں کیا۔ انھوں نے قوم سے غدّاری کی دولت پر غربت کی زندگی کو ترجیح دی۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کے اتباع کی ضرورت ہے۔

محاذِ رائے شماری کو توڑنے کے سلسلے میں محاذ کے لیڈروں نے مختلف اوقات میں مختلف بیانات دیئے۔ اس سلسلے کا حتمی بیان ۱۱ر جولائی کو اُوڑی کے مقام پر مرزا محمد افضل بیگ نے دیا:

"کشمیر ایکارڈ نے کشمیر کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل کر دیا۔ مرکز اور شیخ عبداللہ کے درمیان ایکارڈ کشمیر کے عوام کی خوش حالی اور وقار کا ضامن ہے، اور یہ کسی کے خلاف نہیں ہے۔"



شیخ عبداللہ اور مرزا افضل بیگ

شیخ صاحب اور بیگ صاحب نے وزارت کی گدّی تو سنبھالی تھی لیکن یہ دونوں نہ اسمبلی اور نہ ہی کونسل کے ممبر تھے، اس کے لیے انھوں نے ضمنی انتخاب کے تحت اپنے عہدوں کو قانونی اور اخلاقی حیثیت دینے کا فیصلہ کر لیا۔

شیخ عبداللہ نے حلقۂ انتخاب گاندربل اور مرزا افضل بیگ کے لیے دیوسر اسلام آباد کی سیٹیں خالی کروائیں، ان دونوں حلقوں میں جماعت اسلامی نے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاندربل حلقے میں شیخ عبداللہ کے مقابلے میں اشرف صحرائی اور دیوسر میں مرزا افضل بیگ کے مقابلے میں حکیم غلام نبی کو کھڑا کیا گیا۔

ضمنی انتخاب کی تیاری شروع ہوتے ہی کشمیر اسمبلی کو اس کا کردار یاد دلایا گیا۔ چونکہ ۱۹۵۱ء میں اس اسمبلی کی عصمت انہی اصحاب کے ہاتھوں لٹ چکی تھی اور بعد میں جس نے چاہا اس کو داغدار کیا، اس لیے اسے اس کا کریکٹر یاد دلایا گیا۔ تاکہ یہ اسمبلی سر اونچا کر کے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔

۔۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اگر اسمبلی کا یہ ضمنی انتخاب پاک و صاف طریقے سے انجام دیا جاتا تو نیشنل کانفرنس کے یہ دونوں لیڈر انتخاب جیت لیتے لیکن عادت سے مجبور ہو کر حکومت کی مشنری استعمال کر کے دھاندلی اور دھونس سے

کام لیا گیا اور خوف و ہراس کا ایسا ماحول پیدا کیا گیا گویا ان دو حلقوں میں انتخاب نہیں لڑائی ہو رہی تھی۔

۳ر جولائی سے پہلے ہی جماعتِ اسلامی کے بیشتر کارکن نظر بند کر دیئے گئے اور ووٹنگ کے روز جو کچھ کیا گیا جمہوریت اور حق رائے دہی شرم کے مارے کسی کو اپنا منہ بھی نہ دکھا سکی

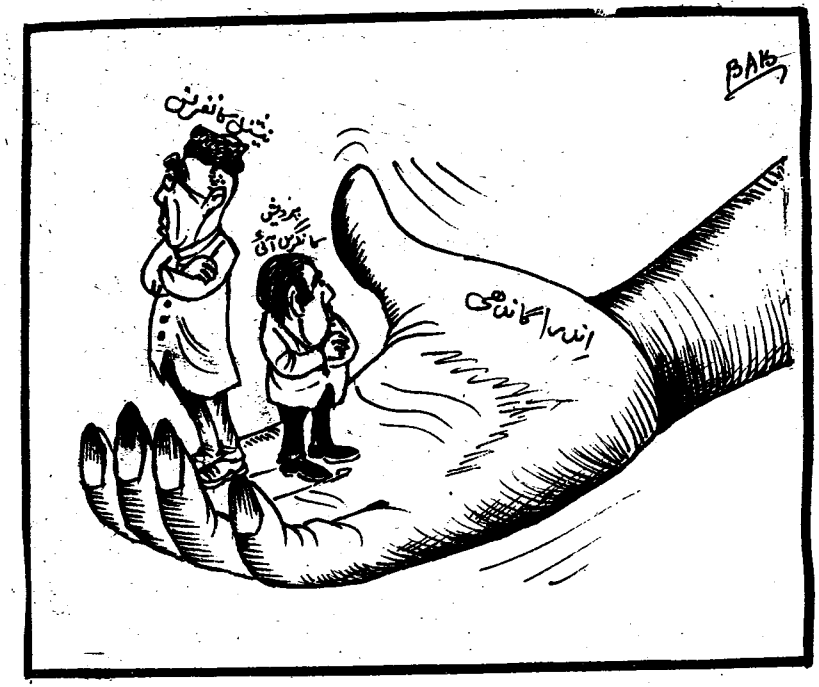
اس طرح

شیخ محمد عبداللہ

اور

مرزا محمد افضل بیگ نے

اپنے عہدوں پر مہرِ تصدیق ثبت کرا دی۔



ریاست کی کانگریس پارٹی ہو یا نیشنل کانفرنس دونوں مسز اندرا گاندھی
یعنی مرکز کے ہاتھوں کے کھلونے رہے۔

ہوئے محکوم کھو بیٹھے متاعِ آبرومندی
گئی ہمت، گئی غیرت، گئی وہ شعلہ سامانی

اعلیٰ عہدے کا ناجائز استعمال

کانگریس اور نیشنل کانفرنس کی آپسی چپقلش

کشمیری عوام کے رہنما شیرِ کشمیر دہلی ایکارڈ کے تحت ریاست جموں و کشمیر کے حاکم اعلیٰ بن گئے۔ تو اپنے عہدے کے طفیل انہوں نے اپنے ذاتی فائدے کے لیے جو احکامات جاری کیے اس سے وہ عام اور خاص نظروں میں مشکوک بن گئے۔

وزیر اعلیٰ نے اپنی ذاتی کوٹھی میں رہ کر اپنے لیے اس کوٹھی کا کرایہ ماہانہ ایک ہزار اور اس کوٹھی کے فرنیچر وغیرہ کا کرایہ چھ سو روپے مقرر کیا اس طرح انھوں نے خزانہ عامرہ سے اپنی تنخواہ کے ساتھ اپنی کوٹھی کا اپنے لیے کرایہ وصول کرنے کا ایک نیا طریقہ رائج کیا۔

دُنیا کو چھوڑ کر سارے ہندوستان میں یہ پہلا اور آخری وزیر اعلیٰ تھا جو اپنی ذاتی کوٹھی میں رہنے کا عوام سے معقول معاوضہ لینے لگا۔

ان کی ذاتی کوٹھی کے لیے جو سامان، فرنیچر قالین، فرنیشننگ، ٹیلنگ اور پردے وغیرہ لائے گئے وہ سرکاری خزانے سے لائے گئے، لیکن نہ صرف وہ ان کی ذاتی ملکیت بن گئے بلکہ اس کا ماہانہ چھ سو روپے معاوضہ بھی وصول کیا گیا۔ اس کوٹھی میں رنگ و روغن کرانے کی ہزاروں روپے کی بچت بھی ہوگئی، یہ سب ایسی باتیں تھیں جو کسی سے پوشیدہ نہ تھیں۔

کانگریس جو خود بھی کبھی لوٹ کھسوٹ میں ملوّث تھی اس نے وزیر اعلیٰ کی اس کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھانا شروع کیا۔

اپنی ذاتی کوٹھی کو سامان ضرورت اور سامان عیش سے مزیّن کرنے کے بعد انہیں اپنی

فیملی کا خیال آیا،
چنانچہ انہوں نے کمشنر نزول کو اپنے ہاں بلوا کر ان سے خالی سرکاری زمین کی تفصیل مانگی کمشنر صاحب نے مختلف جگہوں پر سرکاری زمین کی نشاندہی کی تو شیخ صاحب نے گپکار کی زمین پسند فرمائی اور اسے اپنے دو بیٹیوں کے ساتھ ایک بیٹی کے لیے معمولی معاوضہ مقرر کر کے پٹے پر حاصل کر لیا۔

اس زمین کو پٹے پر حاصل کرنے کے دوران پٹوار حلقہ نہ صرف مار پیٹ کا شکار ہوا بلکہ کمشنر نزول کو بھی ڈانٹ کھانی پڑی۔

حلقہ پٹوار نے اس زمین کا انتخاب بنوا کر اس میں سے دو کنال اور ۶ مرلہ ایک ٹھیکہ دار دیوان مدن لال کی ملکیت دکھائی تھی، وزیر اعلیٰ کا کہنا تھا، اس خطّہ زمین کو بھی نزول کی ملکیت میں شامل کر لو۔ چونکہ ایسا کرنا حلقہ پٹوار کے حدِ اختیار میں نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی، وزیر اعلیٰ کو طیش آیا اور انھوں نے ان کی خوب خبر لی معاملہ کمشنر تک پہنچ گیا تو بعد میں متعلقہ ٹھیکہ دار سے دستبرداری لی گئی اسے نزول کی زمین کے ساتھ شامل کر لیا گیا۔

کاغذات مکمل کرنے کے دوران وزیر اعلیٰ کا تقاضا تھا کہ اس لیز کی میعاد نوّے سال کے بجائے ڈیڑھ سو سال کر دی جائے۔ کمشنر نزول نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اسے آئین و قانون کے منافی قرار دیا۔

چنانچہ نوّے سال کے لیے لاکھوں روپے کی یہ سرکاری زمین حقیر معاوضہ کے مطابق اپنی اولاد میں اس طرح تقسیم کرائی گئی گویا یہ ان کی ملکیتی زمین تھی۔

یہ ساری کارروائی اپنے عہدے کا ناجائز استعمال۔ کنبہ پروری اور لوٹ کھسوٹ کے زُمرے میں آتی تھی اور اس کے مرتکب وہ شیخ صاحب ہوئے جو کانگریسی لیڈروں اور بخشی برادران پر کنبہ پروری کے الزامات لگاتے تھے۔

کانگریس نے ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر فیصلہ جات لینے میں اتنا تنگ کیا کہ لاچار ہو کر انھیں کانگریسیوں کو اپنانا پڑا۔

اپنے ایک بیان میں انھوں نے کہا:۔

"میں کابینہ میں وسعت دے کر کانگریس کے چار اور نیشنل کانفرنس کے چھ وزیر لونگا"

کانگریس نے ان کا یہ فیصلہ نامنظور کر کے نیشنل کانفرنس کے چار اور کانگریس کے چھ وزراء لینے کی تجویز رکھدی، لیکن وزیر اعلیٰ نے کانگریس کے چھ کے بجائے پانچ اور نیشنل کے بھی پانچ مان لیے۔ اس پر کانگریس نے کہا نیشنل کا پانچواں وزیر غیر پارٹی ہو۔

وزیر اعلیٰ نے یہ شرط قبول کر لی۔ چنانچہ نیشنل کانفرنس سے (۱) عطاء اللہ سہروردی (۲) حکیم حبیب اللہ (۳) غلام محمد شاہ (۴) غلام نبی کوچک۔

اور کانگریس سے

(۱) منگت رام شرما (۲) رنگیل سنگھ (۳) بھگت جھجّو رام (۴) چوہدری محمد اسلم (۵) زینب بیگم کو لیا گیا۔

غیر پارٹی ممبر کے لیے نظر انتخاب موہن کشن ٹکّو پر پڑا تو کانگریس نے اسے تسلیم کر لیا لیکن وزارت میں شریک کرنے سے بھی کانگریس مطمئن نہ ہو سکی۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ نیشنل کانفرنس کو کانگریس میں مدغم کیا جائے۔

محاذ رائے شماری کو دفنا کر شیخ صاحب نے کانگریس میں اپنی پارٹی کو مدغم کرنے کے بجائے کانگریسیوں کو نیشنل کانفرنس میں شامل ہونے کی دعوت دی، اس کا آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے سخت نوٹس لیا۔

اس دوران مسز اندرا گاندھی نے اچانک وادیٔ کشمیر کے دورہ کرنے کا پروگرام بنایا اگلے روز ۸ اکتوبر کو شیخ صاحب نے عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"..... کل جب وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی یہاں تشریف لائیں گی تو ان کا ایک یادگار استقبال کیا جائے گا، وزیر اعظم کے ساتھ ہمارے تین طرح کے تعلقات ہیں۔ شریمتی اندرا گاندھی کشمیری نژاد ہیں ان کے خاندان نے خود کو ہماری تحریک کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ اور وہ ہماری وزیر اعظم ہیں۔ ....."

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی بے حد تعریفیں کرنے کے بعد انھوں نے مقامی کانگریسیوں کو آڑے ہاتھوں لیا اور کہا:۔

"یہ لوگ بہروپیے بن کر اور وزیر اعظم کو غلط باتیں بتا کر انہیں ہمارے خلاف بھڑکاتے ہیں یہ لوگ ہماری عزت کا سودا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں نے کروڑوں کی جائیدادیں بنالی ہیں اور شراب کے خم لنڈھائے ہیں۔ یہ لوگ جنہوں نے سالہا سال اپنی زندگی شراب نوشی میں گزاری اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہیں، کیا قوم ان کے سامنے سجدہ کرے گی ان کے لیے ایک ہی صورت ہے کہ عوام کے سامنے اپنا حساب پیش کریں اگر عوام ان کو چھوڑیں گے تو ہم بھی انہیں چھوڑیں گے ....!"


اندرا گاندھی

مسز اندرا گاندھی ۹ اکتوبر ۱۹۷۵ء کو سرینگر تشریف لائیں تو کانگریس اور نیشنل کانفرنس نے ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ان کا زبردست استقبال کیا۔ انہیں ویر سے دریائی جلوس کی صورت میں لایا گیا۔

شام کو ان کے اعزاز میں ایمپوریم گارڈن میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ اپنی مختصر تقریر میں مسز اندرا گاندھی نے فرمایا۔

"کشمیر میں کانگریس کو توڑا نہیں جائے گا اور اگر یہاں اس جماعت کے ساتھ صرف ایک آدمی رہے گا، پھر بھی یہ تنظیم قائم رہے گی۔ کانگریس کو برا بھلا کہنے والے اپنے گریبان میں منہ ڈالیں دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنی کوٹھی کے قیمتی قالین کا کونا اٹھا کر دیکھیں وہاں گرد کی کتنی موٹی تہہ جمی ہے۔"

اسی روز شام کو ریسٹ ہاؤس میں کھانے کی میز پر مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کو مقامی کانگریسیوں کے خلاف تقریر کرنے پر ایسی جھاڑ پلائی کہ شیخ صاحب سکتہ کے عالم میں کھانا بھی نہ کھا سکے۔

مسز اندرا گاندھی نے گورنر، ریاستی کابینہ اور کانگریس کے بعض عہدیداروں کی موجودگی میں شیخ صاحب سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"آپ کانگریسیوں سے حساب مانگیں گے تو کیا یہ لوگ آپ سے حساب

مانگ نہیں سکتے، کیا آپ سمجھتے ہیں ان کے پاس آپ کے کرتوت کا حساب کتاب نہیں ہے، اگر آپ چاہتے ہیں تو یہ سارا حساب آپ کو بھجوا دیا جائے گا تاکہ سبھوں کو پتہ چلے کون کتنے پانی میں ہے ـــ فی الحال آپ پچھلا حساب رکھ دیجیے اور بالکل تازہ حساب بتائیے ـــ جون کے پہلے ہفتے میں جب صدر مملکت فخر الدین علی احمد صاحب یہاں وادی کے دورے پر آئے تھے تو ان کے استقبال میں پبلک کو کنٹرول میں رکھنے کے لیے رام باغ سے لے کر ڈل گیٹ تک سڑک کے دونوں طرف جو سینکڑوں پول اور پچیس ٹن وزنی لوہے کی راڈیں استعمال میں لائی گئیں تھیں یہ سارے پول اور لوہا جو شیخ باغ میں ڈمپ کیا گیا تھا۔ کئی ٹرکوں کے ذریعے یہ سارا مال گپکار پہنچایا گیا جن ٹھیکیداروں کے ذریعہ یہ مال پہنچایا گیا انکے نام محمد صدیق شیخ بوچھوارہ اور غلام قادر آبی گزر ہیں۔

ایک اور ٹھیکہ دار غلام قادر آبی گزر سے ان کو ٹھیوں کے لیے نہ صرف ساٹھ ہزار نقدی وصول کیے گئے بلکہ ڈیڑھ سو بوریاں سیمنٹ بھی حاصل کر لیا گیا۔ گپکار کی ان جملہ کوٹھیوں کا خرچہ بھگت کرم چند کے فرزند مسٹر راجکمار نے ادا کیا جو میڈیکل انسٹی ٹیوٹ صورہ کے خزانچی ہیں۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ سے عمارتی سامان شیخ عبدالسلام کے ذریعے لایا گیا۔

اگر آپ کو یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ جن ٹرکوں کے ذریعے خرد برد کا مال گپکار لیجایا گیا، ان کے مالکوں کو اس کا معاوضہ اپنی جیب سے نہیں بلکہ سرکار اور اوقاف سے دلایا گیا تو آپ کیا کہیں گے ـــ؟"

اس طرح کا انکشاف کر کے مسز اندرا گاندھی نے شیخ صاحب کی پول کھول کر رکھدی تو وہ چپ چاپ سب کچھ سنتے رہے۔

مسز اندرا گاندھی کے واپس جانے کے بعد کئی روز تک آپ بالکل ناراض اور مغموم رہے انھوں نے انتظامیہ میں تطہیر کی غرض سے جن آفیسروں کو چلتا کرنے اور جن آفیسروں پر راشی ہونے کا لیبل لگا کر انھیں اپنے عہدوں سے برطرف کرنے کا اشارہ دیا تھا

اس کام پر انھوں نے ہاتھ روک دیا اور ان سبھوں کو اپنے اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

شیخ صاحب نے اناج کی خوش خریدی کا فیصلہ کیا تو کانگریس نے اس کی زبردست مخالفت کر کے کسانوں کو ان کے خلاف بھڑکایا۔

کچھ مدّت کے بعد وزیر اعلیٰ سے کانگریس کے مزید دو وزراء کابینہ میں لینے کے لیے کہا گیا۔ چنانچہ ان کے نام عبدالغنی گونی اور علی محمد ناپک تجویز کیے گئے۔ وزیر اعلیٰ نے کانگریس کے ان دو وزیروں کو اس شرط پر لینے میں آمادگی ظاہر کی کہ ان کے بعض وزراء کا درجہ بڑھانے میں کوئی اڑچن نہ ڈالی جائے، کانگریس ہائی کمان نے نیشنل کانفرنس کے چار وزراء کا درجہ بڑھانا اس شرط پر مان لیا کہ ان کے دو کے بجائے چار وزراء کابینہ میں لیے جائیں۔ وزیر اعلیٰ نے یہ شرط بھی مان لی البتہ انھوں نے گردھاری لال ڈوگرہ کو کابینہ میں لینے سے انکار کیا۔

راج بھون میں اس سلسلے میں ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ وزراء کو حلف دلانے کی تیاری مکمل ہو چکی تھی کہ کانگریس کے ہائی کمان نے ان نئے وزراء کو حلف کی کارروائی میں شامل ہونے سے منع کیا، کانگریس ہائی کمان کے اس فیصلے سے وزیر اعلیٰ شش و پنج میں پڑ گئے۔ انھیں شک ہوا شاید یہ سب گردھاری لال ڈوگرہ کو ڈراپ کرنے کا نتیجہ ہے، چنانچہ انھوں نے ڈوگرہ صاحب کو بھی کابینہ میں لینے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن کانگریس نے وزیر اعلیٰ پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس کے دو ممبران اسمبلی محمد شفیع اُڑی اور محمد اشرف خاں کو ورغلا رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ نے اس الزام کی تردید کی لیکن کانگریسی پھر بھی مطمئن نہ ہو سکے چونکہ حلف برداری کی کارروائی مکمل ہو چکی تھی اس لیے وزیر اعلیٰ کو تقریب میں شامل ہو کر کہنا پڑا۔

"مجھے امید تھی کہ آج کی تقریب وزارتی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شرکت سے مسرّت انگیز بنے گی اور میں نے اس مقصد کے لیے کانگریس کے چار سرکردہ ارکان کو کابینہ کی سطح پر ہاتھ بٹانے کی دعوت دی تھی لیکن موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدّر ہو گئی اور میں نے محسوس کیا ہے کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت

کے اس مقصد کے حصول میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی اس لیے میں نے گورنر سے استدعا کی کہ اس تقریب کو ملتوی کیا جائے۔"

شیخ صاحب حلف برداری کی اس تقریب کو ملتوی تو کرا سکے لیکن کانگریس نے ان کا دائرہ اتنا تنگ کیا کہ وہ اسے وا نہیں کرا سکے۔

مسز اندرا گاندھی ۲۷ مارچ ۱۹۷۶ء کو دو روزہ دورے پر جموں پہنچ گئیں تو ۲۸ مارچ کو ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کے دوران وزیر اعلیٰ نے نہایت ہی انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مسز اندرا گاندھی طاقت کا ایک سرچشمہ ہے یہ اُس نہرو کی بیٹی ہے جسے کشمیری ہونے پر فخر حاصل تھا۔ اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر مسز اندرا گاندھی کشمیری خاندان کے ساتھ اپنی وابستگی پر نازاں ہے ــــ ہمیں راستہ بتلانے میں ایک رہنما کی ضرورت تھی خوش قسمتی سے خدا تعالیٰ نے ہمیں وہ رہنما مسز اندرا گاندھی کی شکل میں دیدیا.....!"

دو دنوں کے بعد مسز اندرا گاندھی کو رخصت کرتے ہوئے انھوں نے حاضرین کے سامنے فرمایا:

"میں تین نعرے دوں گا۔ تم اس کا جواب اتنی زور سے دینا کہ جب اندرا جی دہلی کے پالم کے ہوائی اڈے پر اُتریں تو یہ آواز وہاں بھی ان کے کانوں میں گونجنی چاہیئے۔"

اس کے بعد شیخ صاحب نے تین بار "مسز اندرا گاندھی" کا نام جتنی زور سے لیا، اُس سے کہیں زیادہ زور سے اُن کے نام کا "زندہ باد" حاضرین سے کہلوایا، لیکن ہر نعرے کے بعد انہوں نے کہا۔ "اور زور سے"

"اندرا گاندھی زندہ باد" کا ورود کرنے کے بعد انہوں نے حاضرین سے تین بار "جے ہند" کے نعرے بھی دُہرائے۔ اس طرح انھوں نے مسز اندرا گاندھی کی خوشنودی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ لیکن مقامی کانگریس کے عہدیدار پھر بھی اپنی حرکات سے باز نہیں آئے۔ انہوں نے ان کی کرسی کی ٹانگیں کھینچنے میں جب

کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تو تنگ آمد بہ جنگ آمد کے مصداق انھوں نے ۲۹ مئی ۱۹۷۶ء کو کوکرناگ میں عوامی اجتماع کے سامنے کانگریسیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:-

"میری خواہش تھی اور امید بھی کہ آج کی یہ تقریب وزرارت کی کونسل میں کانگریس پارٹی کی بھرپور شمولیت سے پُرمسرت بنے گی لیکن یہ بات میرے لیے باعث افسوس ہے کہ وزارتی کونسل کی تشکیل نو اور میونسپل انتخابات جیسے معاملات میں تنظیمی سطح پر کچھ مشکلات اب بھی حائل ہیں مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اور مفاہمت سے کام لے کر ان تمام مشکلات کا تسلی بخش حل بھی نکل آئے گا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میں نے اپنی جانب سے ہر سطح پر کانگریس کا تعمیری تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس مقصد کے پیش نظر میں نے کانگریس کے چار سرکردہ اراکین سے وزارتی سطح پر وزارت میں شامل ہونے کی درخواست کی تھی اس کے علاوہ میں نے آنے والے بلدیاتی انتخاب میں نشستوں کی تقسیم کے معاملہ پر بھی کانگریس پارٹی کو اپنے پورے تعاون کی پیش کش کی تھی چنانچہ اسی جذبے کے تحت ہم نے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ بھی بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا، اس طرح میں نے ہر مرحلہ پر یہ واضح کیا کہ میں کانگریس پارٹی کا سرگرم اور تعمیری تعاون کا بجا طور پر متمنی ہوں۔ بدقسمتی سے موجودہ غلط فہمی سے فضا مکدر ہو گئی ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ آج کی تقریب سے اشتراک و مفاہمت کے اس مقصد کے حصول میں رُکاوٹیں پیدا ہوں گی جو وزرارت کی کونسل کی تشکیلِ نو میں کارفرما تھا۔ اس لیے میں نے گورنر سے درخواست کی کہ آج کی رسمی تقریب منسوخ کی جائے، انہوں نے یہ درخواست منظور فرمائی۔

بہرحال ہم کانگریس کی لیڈرشپ کے ساتھ ایک ایسے حل کی تلاش جاری رکھیں گے جو باہمی طور پر قابلِ قبول ہو، چنانچہ اس مقصد

کے پیش نظر اور مناسب ماحول پیدا کرنے کے لیے حکومت نے کچھ وقت کے لیے بلدیاتی انتخابات بھی ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے یہ اقدامات اس بھروسے اور یقین کے ساتھ کیے ہیں کہ ان سے مفاہمت اور تعاون کے جذبے کو بڑھاوا ملے گا جو ہمیشہ میرا اوّلین مقصد رہا ہے۔ ایسی مفاہمت ایکارڈ کے پس منظر میں اور وسیع تر قومی مقاصد کے لیے بھی اسی طرح یہ بلاشبہ ریاست کی تیز تر ترقی کے لیے بھی لازمی ہے۔ میں پورے خلوص کے ساتھ کانگریس کے تعاون کی قدر کرتا ہوں کیوں کہ اس وقت میرا اقتدار اُن کے ہی تعاون پر منحصر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کانگریس لیڈرشپ معاملات پر از سرِ نو غور کرے گی اور میں نے جو اقدام کیے ہیں ان کے نتیجے میں جو سازگار ماحول قائم ہوگا اس سے ایک تعمیری مطالعہ اور مکالمہ کے لیے راہ ہموار ہوگی۔"

شیخ صاحب کی اس کارروائی سے وقتی طور پر سیاسی بحران ٹل تو گیا لیکن اندر ہی اندر چنگاریاں سلگنے لگیں، مقامی کانگریس کے لیڈر اپنی شرارتوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ نئے وزیروں کو وزارت میں شامل ہونے سے بائیکاٹ کرنے کی ہدایت کے بعد کانگریس کے ممبران اسمبلی کے مستعفی ہونے کی دھمکی کی وجہ سے شیخ صاحب اپنے اقتدار کے لیے خطرات محسوس کرنے لگے۔

حالات اور واقعات گواہ ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں لیکن اقتدار کی رخنہ اندازی کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے، اقتدار کے بارے میں خدشات دیکھ کر انہیں نہ صرف کشمیری عوام (جن میں انسان کم اور بھیڑ بکریاں زیادہ ہیں) یاد آتے ہیں، بلکہ کشمیر کی خصوصی پوزیشن بھی یاد آتی ہے۔

ایسے مواقع پر کشمیری عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے ان کے پاس جو نسخہ ہے فوری طور پر استعمال میں لاتے ہیں۔

۴ نومبر ۱۹۷۶ء کو انھوں نے سوپور کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پچھلے دنوں کانگریس کے مرکزی لیڈروں کے ساتھ مشورہ کر کے ہم نے

اپنی کابینہ میں توسیع کرنا مان لیا تھا۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ ملک کی اتنی بڑی جماعت چار گھنٹے تک بھی اپنے فیصلے پر قائم نہیں رہ سکی، ہندوستان ایک بڑا ملک ہے اور کانگریس کے لیڈر ساٹھ کروڑ عوام کی نمائندگی کرتے ہیں اتنے بڑے ملک کے لیڈروں کا ایک اصول ہونا چاہیئے۔ ان کے فیصلے پر ایک اعتبار ہونا چاہیئے اتنے بڑے ملک کے لیڈر صرف چار گھنٹے کے اندر ہی اندر اپنے فیصلے بدل دیتے ہیں آخر کوئی اخلاقی معیار بھی ہونا چاہیئے ہم ایمانداری کے ساتھ کانگریس کو اپنی کابینہ میں نمائندگی دینا چاہتے تھے۔ ہم سمجھتے تھے ان کا یہ مطالبہ ناجائز نہیں ہے، اس سلسلے میں وزیروں کے چننے کا اختیار میرا تھا، مجھے کانگریس کے وزیروں کے ناموں کے اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اگر نئی دہلی میں ان ناموں پر اتفاق ہوا ہوتا"

سوپور کے بعد وزیر اعلیٰ اسلام آباد کے دورے پر گئے۔ شیخ صاحب نے اسلام آباد چوک میں عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔ اس موقع پر کانگریس کے ۱۵ ارکان بھی اسٹیج پر موجود تھے جنہوں نے کانگریس سے علیحدہ ہو کر نیشنل کانفرنس میں شمولیت اختیار کی تھی۔ ان میں عبدالغنی لون اور محمد اشرف خاں قابلِ ذکر ہیں۔

شیخ صاحب نے اپنی تقریر میں کہا:-

"گزشتہ ہفتہ جو واقعات رونما ہوئے مختلف لوگ ان واقعات کو مختلف طریقوں سے پیش کر رہے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ جو سمجھوتہ ہوا، اس میں ایک حد یہ تھی کہ نئی اسمبلی قائم کی جائیگی جو ان تمام مرکزی قوانین پر نظر ثانی کرے گی جن کو ۱۹۵۳ء کے بعد ریاست پر لاگو کیا گیا۔ اس وقت ہندوستان میں حالات اچھے نہیں تھے۔ گجرات اور بہار میں اسمبلیاں توڑنے کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ ایسے حالات میں اگر ریاست کی اسمبلی کو توڑنے کا مطالبہ کیا جاتا تو بہار اور گجرات

لہ شیخ صاحب بہانہ ڈھونڈنے کے لیے کونسی دور کی کوڑی لے آئے۔ کشمیر کی خصوصی (باقی اگلے صفحہ پر)

میں ایسا مطالبہ کرنیوالوں کی ایک جواز مل جاتا۔ اس وقت میں نے مرکزی لیڈروں سے کہا کہ میرے پاس جب اپنی اسمبلی نہیں تو میں حکومت کیسے چلا سکتا ہوں، مجھے یقین دلایا گیا کہ کانگریسی ممبران اسمبلی میرا پورا ساتھ دیں گے۔ وزیر کا انتخاب کرنے میں، میں آزاد ہوں گا اور اسمبلی اور اسمبلی سے باہر کسی کو بھی اپنی وزارت میں، میں لے سکتا ہوں، اس وقت تک کچھ معاملات حل طلب تھے۔ ان کے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے چل کر ان کو حل کیا جائیگا۔[۲]

حکومت کی ذمہ داریاں سنبھالتے وقت میں نے یہ بات بالکل واضح کر دی کہ میں ۸ اگست ۱۹۵۳ء کی ہی پوزیشن سے شروع کروں گا ۱۹۵۳ء کے بعد جو کچھ کیا گیا اسے میں کسی بھی صورت میں تسلیم نہیں کروں گا،

چنانچہ طے ہوا کہ انتخابات کے بعد نئی اسمبلی تمام قوانین پر نظر ثانی کرے گی۔ اسمبلی کو اختیار ہوگا کہ وہ جن قوانین کو مفید اور فائدہ مند سمجھے ان کو باقی رکھے جن مرکزی قوانین سے ریاست کی اندرونی خود مختاری متاثر ہو رہی ہو ان کو اسمبلی واپس کر سکتی ہے، ان شرائط کے بعد ہم نے حکومت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ کانگریسی اپنے وعدے پر قائم نہیں رہے انہوں نے ہمارے کچھ وعدوں سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہمیں آگے بڑھنے نہیں دیا، اس بات پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ اس وقت ہم بہت ہی خطرناک حالات سے گزر رہے ہیں ہم نہیں بتا سکتے کہ آگے کیا ہوگا۔ میں وزیر اعظم شریمتی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) پوزیشن کا دعوے دار اور دفعہ ۳۷۰ کا رکھوالا بہار اور گجرات کے حالات کا تذکرہ کر کے خود ہی کشمیر کی خصوصی پوزیشن کی مٹی پلید کر رہا ہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [۲] پھر آگے چل کر ان کو حل کیوں نہیں کیا جبکہ اسمبلی میں آپ کو بھرپور حمایت حاصل تھی۔

[۱] یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ شیخ صاحب کو وزیر اعلیٰ کا یو چانس اس بھروسے پر دیا گیا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ریاست کی خصوصی پوزیشن یعنی دفعہ ۳۷۰ کو وہ منسوخ کر دیں گے۔ اس کے ثبوت میں تفصیلات آگے صفحات میں آئیں گی۔

اندرا گاندھی سے کہنا چاہتا ہوں کہ جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس سے ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اگر ہندوستان کو ہم پر اعتبار نہیں تو سارا قصہ ختم کیا جانا چاہیئے۔ ہم نے طوفان دیکھے ہیں ہم میں اب تک کسی بڑی سے بڑی طاقت سے مقابلہ کرنے کی قوت ہے یہ آج کی بات نہیں ہم نے ان حالات میں بھی طوفان سے مقابلہ کیا جب ہمارا کوئی یار و مددگار نہیں تھا۔ آج ہزاروں جوان قوم کی عزت و آبرو[1] بچانے کے لیے جان کی بازی لگانے کے لیے تیار ہیں۔ ہندوستانی لیڈر اگر کشمیری عوام کا اشتراک چاہتے ہیں تو ان کو اپنا طریقہ بدلنا ہوگا۔"



تقریروں کے اس سلسلے میں انھوں نے ۲۹ اکتوبر کو چرار شریف میں عوامی اجتماع سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔

"میں لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ہماری جنگ ابھی جاری ہے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک ہماری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے ہم کسی بڑی سے بڑی طاقت کو بھی کشمیری عوام کو دوبارہ زنجیریں[2] پہنانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اگر کسی کو گمان ہے کہ وہ روپے کے بل بوتے پر کشمیری عوام کو خرید سکتا ہے تو وہ بھول رہا ہے۔ ۲۲ سال تک انھوں نے یہاں کے لوگوں کو خریدنے

---

[1] صاف ظاہر ہے کہ شیخ عبداللہ نے اپنے ذاتی اقتدار کو قوم کی عزت و آبرو کے ساتھ منسوب کیا تھا۔ اور اس اقتدار کے لیے وہ کشمیر کے جوانوں کو (بھیڑ بکریوں) کو قربانی دینے کے لیے تیار کر رہے تھے۔

[2] شیخ صاحب شاید اپنے اقتدار کو کشمیری عوام کی آزادی اور دوسروں کی حکومت کو غلامی کی زنجیر سمجھتے ہیں، اسی لیے وہ کہہ رہے ہیں میں دوبارہ کشمیری عوام کو زنجیریں پہنانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ کشمیری عوام یہ پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ یہ زنجیریں کب اتاری گئی تھیں جن کو آپ دوبارہ پہننے کی اجازت نہیں دیں گے۔

کی کوشش کی، کشمیری عوام نے اپنے آپ کو خریدنے سے انکار کیا۔ ۲۲ سال گزرنے کے بعد بھی لڑائی جاری ہے۔

کانگریس کو یاد رکھنا چاہیئے جس طرح پہلے اسے یہاں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے آئندہ بھی اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم غالباً ابھی تک اپنی جدوجہد میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ آئندہ کیا ہوگا اس کا حال خدا کو ہی معلوم ہے، ہم اپنی تقدیر کے ساتھ کسی کو کھیلنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ کشمیری عوام ان لوگوں کے ہاتھ میں اپنی تقدیر نہیں سونپ سکتے جنہوں نے ہماری عزت و آبرو کے ساتھ کھیلا ہے۔"

وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کا جس میں شکوہ، دھمکی اور انکساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی اس کا کوئی اثر مقامی کانگریس نے قبول نہیں کیا۔ انھوں نے انھیں پریشان کرنے کا کام جاری رکھا۔

مقامی کانگریسیوں کے ہاتھوں کشمیر کے سب سے بڑے عوامی رہنما "شیر کشمیر" کی تذلیل سنجیدہ اور سمجھ دار طبقہ کے لیے مایوسی اور ناامیدی کا باعث بن گئی حتیٰ کہ کانگریس پارٹی میں بھی اس طریقۂ کار کے کارن پھوٹ پڑ گئی اور اس جماعت کے آٹھ ممبران اسمبلی نے کانگریس کے ساتھ قطع تعلقات کر کے اپنا جو علیحدہ گروپ بنایا وہ کانگریس کا باغی گروپ کہلایا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو 'آزاد گروپ' کے نام سے منسوب کیا۔ اس گروپ میں عبدالغنی لون، محمد اشرف خان، نثار اللہ ڈار، عبدالمجید بانڈے، محمد یٰسین شاہ، غلام حسن مسعودی، غلام قادر وار اور علی محمد میر شامل تھے۔

بعد میں نیشنل کانفرنس کی ایک خصوصی تقریب جو پولو گراؤنڈ میں منعقد کی گئی، آزاد گروپ، نیشنل کانفرنس میں شامل ہو گیا۔ البتہ نیشنل کانفرنس میں شامل ہو کر بہت جلد اس گروپ نے دیکھا، یہاں اس تنظیم میں انھیں وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیئے بلکہ جب ان کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تو عبدالغنی لون کے ساتھ دو اور ممبران نیشنل کانفرنس کو خیرباد کہہ گئے۔

آٹھ ممبران کے چلے جانے سے جب کانگریس ٹوٹ گئی تو شیخ عبداللہ نے اپنے بڑے بیٹے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو تنظیم میں لانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ان کے جانشین

ہونے کا دروازہ کھول دیا۔

۲۱ جولائی ۱۹۷۶ء کو ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو یوتھ نیشنل کانفرنس کا صدر بنایا گیا۔ رسم کے مطابق سابقہ صدر اے، آر، وانی نے ڈاکٹر فاروق سے استدعا کی کہ وہ یوتھ نیشنل کانفرنس کی صدارت قبول کریں۔ اس موقع پر فاروق عبداللہ نے فرمایا:



"یوتھ نیشنل کانفرنس نے مجھے اعتماد دے کر مُلک، خاص کر نوجوانوں کی خدمت کرنے کی اہم ذمہ داری سونپی، مجھے یقین ہے کہ میں اپنے آپ کو یہ ذمہ داری نبھانے کا اہل ثابت کروں گا۔"

کانگریس اپنی کارکردگی کے کارن ٹوٹنے کے بعد بھی شیخ عبداللہ کے لیے مشکلات پیدا کرنے میں پیچھے نہیں ہٹی۔

مقامی کانگریس کو دو پھاڑ کرنے کے باوجود بھی مرکز کی کانگریس سرکار نے اس کا سنگین نوٹس کیوں نہیں لیا۔؟ اگر مرکز چاہتا تو اسی بات پر انھیں وزارت سے سبکدوش کرا دیتا۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔؟ اس لیے کہ وہ شیخ صاحب سے دفعہ ۳۷۰ ہٹانے کا کام لینا چاہتے تھے۔ اور اس کام کی عمل آوری سے پہلے وہ انھیں وزارت سے ہٹانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

مرکزی سرکار نے شیخ صاحب کا اتنا بڑا قصور محض اس لیے معاف کر دیا تاکہ وہ اپنا وعدہ پورا کر سکیں، چنانچہ جب انہیں اس وعدے کی یاد دہانی کرائی گئی تو انھوں نے پیش بندی کے طور پر "لینڈ گرانٹس بل" پیش کرایا، تاکہ اس کا ردِ عمل دیکھا جائے۔

چنانچہ دفعہ ۳۷۰ کو کھوکھلا کرنے کے لیے شیخ صاحب نے گورنر کے ذریعے ایک خاص آرڈیننس جاری کروایا۔ یہ آرڈیننس جاری کرانے کے لیے اخلاقی طور پر ممبرانِ اسمبلی کا اعتماد حاصل کرنا ضروری تھا۔ مگر اسمبلی سیشن سے پہلے ہی اُسے نافذ کرایا گیا تاکہ وہاں اپوزیشن ممبران مخ چخ نہ کر سکیں۔ اسمبلی سے باہر اس قسم کا آرڈیننس جاری کرانا ایوانِ اسمبلی کی توہین سے ہرگز کم نہ تھا۔

دفعہ ۳۷۰ کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کی بدنیتی اصل میں اُسی وقت عیاں ہو گئی تھی جب اس لیڈر شپ نے آئینِ ہند کی ۴۲ ویں ترمیم کے بارے میں لب کشی کی، جبکہ وہ بخوبی جانتے تھے ۴۲ ویں ترمیمی بل سے دفعہ ۳۷۰ کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے، اور ریاست کی خصوصی پوزیشن کو ختم کرنے کا ہتھیار حاصل کر لیا ہے۔

لینڈ گرانٹس بل جس کے تحت بیرونی سرمایہ داروں کے لیے کشمیر کی سرزمین حاصل کرنے کا راستہ کھول دیا گیا۔ اس کے بارے میں شری پریم ناتھ بزاز کا کہنا ہے:

"لینڈ گرانٹس بل کا نفاذ اسی بلا تحریر اقتدار نامے کی وعدہ وفائی تھی جس کے تحت کشمیر کی حور صفت اور دُلہن نما خوبصورت سرزمین کی آغوش بے اصول سرمایہ داروں اور بے حیا پونجی پتیوں کے لیے کھول دی گئی اور جس پر عملدرآمد کا نتیجہ صرف یہی ہوتا کہ ریاستی باشندے خود اپنے وطن میں باورچیوں اور کنیزوں کی صورت اختیار کر کے عیش کا سامان اور ہوس کا ایندھن بن جاتے۔"

لینڈ گرانٹس بل جسے گورنر نے جاری کیا حسب ذیل ہے:

ضمیمہ

حکومت جموں وکشمیر۔ سول سیکریٹریٹ، محکمہ قانون۔

جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس (ترمیمی) آرڈیننس ۱۹۷۶۔ آرڈیننس نمبر ۳ برائے ۱۹۷۶ء گورنر کی جانب سے جمہوریہ ہند کے ستائیسویں سال میں لاگو کیا گیا۔

اس آرڈیننس سے جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس ایکٹ ۱۹۶۰ء میں ترمیم کرنا مقصود ہے۔

چونکہ ریاستی قانون ساز یہ سیشن میں نہیں ہے اور گورنر کو اطمینان ہے کہ ایسے حالات موجود ہیں جن کے سبب اُس کے لیے فوری اقدام کرنا ضروری بن گیا ہے، لہٰذا گورنر اپنے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو اسے آئین جموں وکشمیر کی دفعہ ۹۱ کے تحت عطا کیے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل آرڈیننس کے نفاذ کی منظوری دیتے ہیں:

(۱) مختصر عنوان اور عملدرآمد

اس آرڈیننس کو جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس (ترمیمی) آرڈیننس ۱۹۷۶ء کے نام سے پکارا جائے گا۔

(۲) اس پر فوری طور پر عمل درآمد کیا جاسکے گا۔

۱۹۶۰ء کے ایکٹ ہشتم کے سیکشن (۴) کی ترمیم، جموں وکشمیر لینڈ گرانٹس ایکٹ ۱۹۶۰ء کے سیکشن (۴) کی شق نمبر (۱) میں ان الفاظ کے بجائے پابندی صنعتی اور تجارتی ترقی کے مفاد میں نرم کی جاتی ہے۔ "کی بجائے" یہ پابندی صنعتی اور تجارتی ترقی کے مفاد یا ٹوریسٹ انڈسٹری کی ترقی کے مفاد میں یا دوسرے مقصد یا مقاصد جن کی حکومت وقتاً نوٹیفکیشن کے ذریعے تشریح کرتی رہے گی، کے الفاظ درج کئے جائیں۔"

دستخط:

ایل، کے، جھا۔ گورنر

نوٹ:۔ اس آرڈیننس کے جاری کرانے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کے دل کا چور واضح ہوجاتا ہے۔ ایک طرف وہ اس کے لیے صنعتی اور تجارتی ترقی کی آڑ لے کر ملک کے سرمایہ داروں کے لیے ریاست میں آنے کا دروازہ کھول رہے ہیں لیکن دوسری طرف اس میں اس بات کی گنجائش بھی رکھی ہے کہ وہ اس سرزمین میں آکر اور یہاں بود وباش کرکے اپنی مرضی کے تحت اسے استعمال کرسکے گی اس غرض کے لیے آرڈیننس میں صاف طور پر واضح ہے۔ دوسرے مقصد یا مقاصد جن کی حکومت وقتاً فوقتاً نوٹیفکیشن کے ذریعے تشریح کرتی رہے گی۔

حکومت کے دوسرے مقصد یا مقاصد کیا ہوسکتے ہیں اس کی تشریح کی یہاں کوئی ضرورت نہیں۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ کی طرف سے اتنا کچھ کرانے کے باوجود بھی انڈین نیشنل کانگریس مطمئن نہیں ہوئی، چنانچہ اس نے دہلی سے ڈور کھینچنے کا سلسلہ جاری رکھا ۱۹۷۵ء کی تکمیل 'ایکارڈ' سے لے کر ۱۹۷۷ء کے اعتماد واپس لینے تک شیخ عبداللہ کے تخت میں اتنی لمبی لمبی کیلیں لگادی گئیں کہ وہ ایک ساعت کے لیے بھی اطمینان کے ساتھ اس تخت پر بیٹھ نہ سکے۔

اس کے ساتھ ہی ان کے تاج میں اتنے کانٹے بوئے گئے کہ وہ لمحہ بھر کے لیے بھی اس تاج کو سر پر نہ رکھ سکے۔ شیخ عبداللہ کی وزارت کے یہ اڑھائی سال کس طرح گزر گئے اُس کے بیان سے زبان ہکلاتی ہے اور قلم لکھنے سے انکاری ہے۔

ان اڑھائی برسوں میں شیخ عبداللہ کو جن حالات سے گزرنا پڑا اور جو واقعات ان کو پیش آئے اس کو دیکھ کر ایک عام آدمی جس کے پاس ذرا سا بھی ضمیر اور تھوڑی سی بھی عزت ہو ہرگز ہرگز ایسے تخت وتاج کو برداشت نہیں کرسکتا بلکہ وہ تو اُسے ٹھوکر مار دیتا۔

شیخ عبداللہ جیسی قدآور شخصیت جو اس بات کی دعویدار تھی۔

"کبھی خم نہ ہوسکی میری گردن"

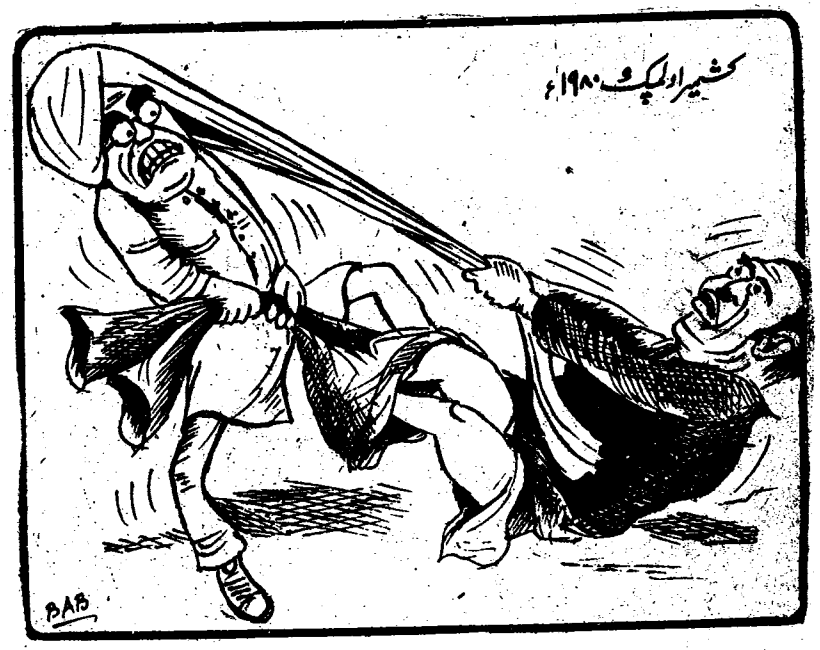
قدم قدم پر بے عزتی اور رسوائی کو برداشت کیسے کرسکی؟

وزارت کے ان ڈھائی سالوں میں شیخ عبداللہ جیسے بین الاقوامی شہرت کے لیڈر کو ایک معمولی کانگریسی ورکر تگنی کا ناچ نچانے لگا تو مجبوراً انہیں شاہی مسجد میں ایک عوامی اجتماع کے سامنے کہنا پڑا۔

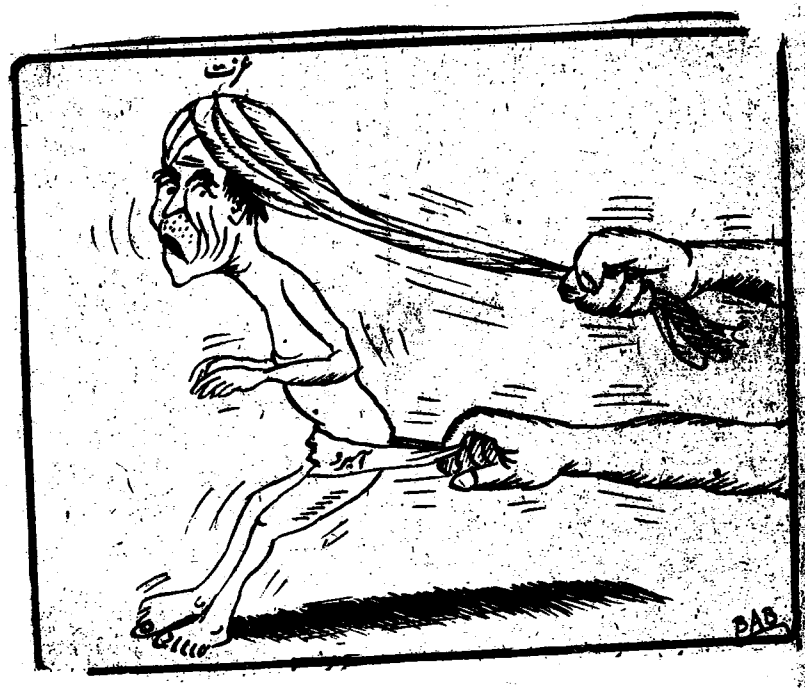
"اگر کانگریسیوں کا یہ خیال ہے کہ اقتدار سپرد کرنے سے ہماری ۱۹۳۱ء کی تحریک ختم ہوگئی ہے تو وہ ان کی غلط فہمی ہے اور خام خیالی ہے وہ چاہیں تو اسمبلی میں عدم اعتماد کرکے یہ اقتدار مجھ سے واپس لے سکتے ہیں ہم ۱۹۳۱ء کی تحریک پھر شروع کرسکتے ہیں"

وزیراعلیٰ نے کانگریسیوں کو جو یہ دھمکی دی اس کا کسی نے بھی کوئی خاص اثر نہیں لیا، دراصل ان کی آواز میں جو اثر ہوا کرتا تھا وہ زائل ہوچکا تھا۔

۱۹۷۵ء کا ایکارڈ جن حالات میں ہوا تھا اور اس کا جو ماحصل تھا وہ سب لوگوں کے سامنے آچکا تھا، اس ایکارڈ نے کشمیریوں کے رہنما کا وقار داؤ پر لگا دیا تھا۔ لہٰذا ۱۹۳۱ء کی تحریک دوبارہ شروع کرنے کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوسکا۔



کشمیری عوام کے رہنما اپنے اصول اور آدرش تیاگ کر کے کانگریس کے
رحم و کرم پر جو اقتدار حاصل کر چکے اس اقتدار سے انہیں ہٹانے کا منظر



کشمیر کے عوامی رہنما نے ایکارڈ کے تحت جب اقتدار سنبھالا تو انھوں نے
دعویٰ کیا تھا میں ریاست میں کھوئی ہوئی عزت و آبرو کو بحال کروں گا
ریاستی کانگریس نے انکی عزت و آبرو کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے ان کی
جو عزت و آبرو بحال کر دی اسی کا ایک منظر۔



مقامی کانگریس اور نیشنل کانفرنس کے درمیان اقتدار کی لڑائی کا
ایک منظر

جو دے رہا ہے زمانے کو روشنی کا فریب
اُس آفتاب کے اندر بھی اک اندھیرا ہے

کشمیر میں جنتا پارٹی کا قیام

نیشنل کانفرنس کی نئی حکمتِ عملی

ریاست بھر میں نیشنل کانفرنس اور پردیش کانگریس کے درمیان حالات بالکل مخدوش تھے۔ اُدھر ملک بھر میں افراتفری کا عالم تھا۔ فسادات نے سارے ملک کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیا تھا۔ ہندوستان کی اپوزیشن سرکار کا ناک میں دم کیے ہوئے تھی۔

حالات بد سے بدتر ہو گئے تو لاچار ہو کر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے صدر مملکت فخر الدین علی احمد سے رجوع کیا اور ملک بھر میں ایمرجنسی نافذ کرا دی گئی۔



اندرا گاندھی فخر الدین علی احمد

عوام کے لیے شہری حقوق سلب کر دیئے گئے۔

۲۹ جون کو صدر مملکت کا حکم ریاست جموں و کشمیر تک بڑھا دیا گیا۔ ایسا ریاستی سرکار کی درخواست پر کیا گیا۔ دفعہ ۳۷۰ کا دم بھرنے والے ملک سے ایمرجنسی کو مستعار لے آئے۔ تمام ریاستوں میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ ۴ جولائی کو مرکزی سرکار نے آر۔ ایس۔ ایس اور جماعت اسلامی سمیت چھبیس تنظیمیں خلاف قانون قرار دیں، اسی روز سے وادیٔ کشمیر میں گرفتاریوں کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

قایم کیا۔ کانگریس کے سابقہ ممبر پارلیمنٹ ششی بھوشن جو سرینگر آئے ہوئے تھے اور یہاں گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے، مولوی محمد فاروق سے ٹیلی فون پر ملاقات کا وقت مقرر ہوا اگلے روز رات کے ۱۲ بجے کے قریب ششی بھوشن مولوی فاروق سے ملے، دونوں کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ ہوا۔



(افتخار حسین انصاری)

اگلے روز مولوی فاروق نے سرینگر کی سیٹ پر محمد فاروق رحمانی کی حمایت واپس لے کر اپوزیشن اتحاد کو دم بخود کر دیا۔

حسبِ عادت اور حسبِ منشاء مسلم اتحاد کو اس وقت زک پہنچائی جب اس کی بڑی ضرورت تھی۔

مولوی فاروق کی اس کاروائی سے ناراض ہو کر محمد فاروق رحمانی نے کاغذات نامزدگی داخل کرنے سے اجتناب کیا، صوفی محمد اکبر ناراض ہو کر واپس سوپور چلے گئے۔ البتہ جماعت اسلامی اور پولیٹیکل کانفرنس کے لیڈروں کے مشورے پر فضل الحق قریشی نے کاغذاتِ نامزدگی داخل کر دیئے۔ کاغذات داخل کر کے جب وہ واپس آئے تو حق رائے دہی اور جمہوریت منہ پھاڑے اس کا انتظار کر رہی تھی چنانچہ انہیں گرفتار کرنے کے ساتھ ہی ان کے کاغذاتِ نامزدگی مسترد کر دیئے گئے۔



مولوی فاروق

میر واعظ مولوی محمد فاروق کو عوام کے ایک طبقے کی بھرپور حمایت حاصل ہے اس بات کو مدنظر رکھ کر انتخابات یا قومی مسائل میں جب جب مسلم رہنماؤں کو باہم اتحاد و اتفاق کی ضرورت محسوس ہوئی تو سب سے پہلے مولوی صاحب پر نظر پڑتی اور ان کی طرف رُخ کیا جاتا۔ مولوی صاحب ایسے موقعوں پر اپنی طرف سے بھرپور حمایت دینے کا وعدہ ضرور کرتے ہیں، لیکن اکثر حالات میں ان کی طرف سے مایوسی ہوا کرتی تھی۔

ان پر آس لگانے والے اکثر منہ کی کھاتے ہیں اور یہ شکایت کرتے ہیں کہ حکمراں جماعت کو ناراض کرنے میں یہ دلچسپی نہیں رکھتے۔

چونکہ مولوی افتخار حسین انصاری کو کانگریس کی پشت پناہی حاصل تھی اس لیے

اُن کے کاغذات کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی البتہ شہر میں شیعہ سُنّی کا شوشہ پھیلا کر شیعہ سُنّی فسادات کے ذریعے میدان انتخاب کو میدان فتح میں بدلنے کا طریقہ استعمال کیا گیا۔

مولوی افتخار حسین کے شیعہ ہونے اور شیعوں کے بارے میں من گھڑت کہانیوں کا اتنا زور دار پروپیگنڈہ کیا گیا کہ اکثر سنّی شیعوں کو اچھوت سمجھنے لگے۔ شیعوں کے بارے میں بعض ایسی خبریں زبانی زبانی دُور دُور تک پہنچائی گئیں کہ بیشتر لوگ شیعوں کو دوسری مخلوق سمجھنے لگے۔

اس کے باوجود بھی نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ کے مخالف مولوی افتخار حسین انصاری کی حمایت کرنے لگے تو مجاہد منزل سے نیشنل فوج کے لئے خصوصی کمک بھیج دی گئی، جس سے مولوی انصاری کے جلسے اور جلوس تتر بتر ہونے لگے۔

انصاری صاحب پر حملے شروع ہو گئے۔ ان کی جیپ جلائی گئی اور جگہ جگہ پتھراؤ کا انہیں سامنا کرنا پڑا۔

شیعہ سنّی کے بعد شیر اور بکرا لڑائی میں طرفین کے بہت سارے لوگ زخمی ہوئے۔

پولنگ کے دن وہی حربے استعمال کیے گئے جو نیشنل کانفرنس ایسے موقعوں کے لیے ریزرو رکھتی آئی ہے۔ حلقۂ انتخاب اسلام آباد میں کانگریس کے امیدوار محمد شفیع قریشی کے خلاف نیشنل کانفرنس خفیہ مہم چلا رہی تھی۔ بارہمولہ حلقۂ انتخاب میں عبدالاحد وکیل کا مقابلہ جماعت اسلامی کا مجوس لیڈر سیّد علی شاہ گیلانی کر رہا تھا۔

جماعت کے بیشتر کارکن پہلے ہی ایمرجنسی کی آڑ میں گرفتار کر لیے گئے تھے اور جو باقی ورکر گیلانی صاحب کی الیکشن مہم میں حصّہ لے رہے تھے دوسرے دن ان کو گرفتار کر کے غائب ہی کر دیا جاتا۔

اس انتخاب میں وادیٔ کشمیر سے نیشنل کانفرنس اور کانگریس اپنے پُرانے ہتھکنڈوں سے انتخاب جیت تو گئی لیکن ہندوستان بھر میں جنتا پارٹی نے حکمراں کانگریس کو برسوں کے بعد عبرتناک شکست دے کر اقتدار حاصل کر لیا۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی راج نرائن کے ہاتھوں شکست کھا گئی۔ ان کے بیٹے سنجے گاندھی کے ساتھ کانگریس کے کئی لیڈر لڑھک گئے۔ کانگریس کی اس شکست نے اس تنظیم کا شیرازہ

بکھیر کر رکھ دیا۔

اس شکست کا ذمہ دار مجموعی طور پر مسز اندرا گاندھی کی آمرانہ پالیسی کو ٹھہرایا گیا۔ آزادی کے تیس برس بعد کانگریس کو اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مسز اندرا گاندھی کے بہت سے دیرینہ ساتھی اور کانگریس کے بعض اہم ستون ان کا ساتھ چھوڑ کر الگ ہو گئے۔

۲۴ مارچ کو مرارجی ڈیسائی ہندوستان کے وزیر اعظم بن گئے اور اسی روز سے ہندوستان کی تاریخ میں جنتا پارٹی کا باب درج ہو گیا۔

مرکز میں کانگریس کی شکست نے ریاست میں کانگریس پارٹی کے ہوش و حواس اُڑا دیئے اور وہ ہاتھ پاؤں مار کر شیخ عبداللہ کو اقتدار سے محروم کرنے میں جلد بازی دکھانے لگے۔

مرکز میں کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تو ریاست میں شیخ عبداللہ کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیئے گئے کہ شیخ عبداللہ یا تو وزارت چھوڑ دیتے نہیں تو وزارت ان کو چھوڑ دیتی۔ بہر حال قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کانگریس نے شیخ عبداللہ سے اعتماد واپس لے کر مفتی محمد سعید کو پارٹی کا لیڈر منتخب کیا، ایک طرح سے انھوں نے مفتی محمد سعید کی سربراہی میں کابینہ بھی تشکیل دی اور جب وہ اپنی اکثریت جتانے گورنر کے پاس گئے تو گورنر نے مرکز سے رجوع کیا۔



مفتی محمد سعید

اسی دوران وزیر اعلیٰ نے اسمبلی توڑنے کی سفارش کی جسے مرکز کی ہدایت پر گورنر ایل۔ کے جھا نے قبول کر کے مقامی کانگریس کا خواب چکنا چور کر دیا۔

شیخ صاحب کا وزارت سے محروم ہونا ہی تھا کہ دبے کچلے اور ناراض اشخاص سب اکٹھے ہو گئے۔ ان کے پرانے دشمن نئے دشمنوں کے ساتھ مل گئے۔

وادی کشمیر کا کشمیر موٹر ڈرائیورز ایسوسی ایشن، جو ۱۹۳۱ء سے برابر ان کا ساتھ دے رہا تھا۔ اور جن کے بل بوتے پر شیخ صاحب نے کشمیر میں مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو سر اُٹھانے نہیں دیا، جن کی پشت پناہی سے انہوں نے مسلم اتحاد کو یہاں پنپنے نہیں دیا۔ اور جن کے مکمل اور بھرپور تعاون سے وہ پاکستان کو مسترد کر کے ہندوستان

کو اپنا سکا۔ وہ ایسوسی ایشن دو حصّوں میں بٹ گئی۔

اس کے ایک حصّے نے باغی ہو کر سرینگر میں جنتا یونٹ قائم کیا اور جنتا پارٹی کا پہلا جھنڈا اسی باغی گروپ نے یہاں نصب کیا۔

اسلام آباد کے غلام رسول کوچک اور ڈاکٹر عبدالمجید جو شیخ عبداللہ کے دیرینہ ساتھی اور ان کے زبردست حامی تھے۔ فوراً سرینگر آ گئے اور بڑے ڈاک گھر کے پاس میونسپل پارک جو شیر کشمیر پارک بنا دیا گیا تھا اس کا سائن بورڈ اُتروا کر اس کی ارتھی بنا دی۔

چند لوگوں نے اس ارتھی کو کندھا دیا اور باقی لوگ اس ارتھی کے ساتھ چل کر شیخ عبداللہ کی ذات پر رکیک حملے کرنے لگے۔

ارتھی کو لال چوک پہنچا کر اور بیچ سڑک پر رکھا گیا۔ بعض من چلے جوانوں نے اس سائن بورڈ کو پاؤں تلے روندھا پھر اس پر پرانے کپڑے اور گھاس پھوس رکھ کر اسے نذر آتش کیا گیا ــــ جس وقت شیر کشمیر پارک، نام کا یہ سائن بورڈ جل رہا تھا ــــ کئی جوشیلے جوان اُچھلتے کودتے طوفانِ بدتمیزی کر رہے تھے، یہ سارا کھیل غلام رسول کوچک اور ڈاکٹر عبدالمجید کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ کے، ایم، ڈی کا ناراض یونٹ ان کا ساتھ دے رہا تھا ــــ شیخ صاحب کے بعض حریف جو برسوں سے گوشہ نشین ہو گئے تھے سامنے آ کر ایکارڈ کی مخالفت کرنے لگے ــــ جگہ جگہ نیشنل کانفرنس کے جھنڈے، سائن بورڈ اور بیز اُتارے گئے

جنتا پارٹی کی شاخ قائم کرنے کے لیے مرکز سے اشوک مہتہ، ناناجی دیشمکھ اور بھانو پرتاپ سنگھ یہاں آ گئے انہوں نے مولانا مسعودی غلام محی الدین قرہ اور مولوی فاروق کے ساتھ کئی میٹنگیں کرنے کے بعد ۱۸ اپریل کو مولانا مسعودی کی سربراہی میں مقامی جنتا پارٹی قائم کی ان کے ساتھ جو دوسرے لیڈر جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے، ان میں مولوی فاروق، غلام محی الدین قرہ، پریم ناتھ بزاز،



(مولوی فاروق) مولانا مسعودی (غلام محی الدین قرہ)

عبدالغنی لون، مولوی افتخار حسین انصاری، شمیم احمد شمیم، عبدالرشید کابلی، غلام رسول کوچک، ڈاکٹر عبدالمجید۔ پیرزادہ علی شاہ، جی، ایم، باون، غلام نبی خیالی، چوہدری محمد شفیع اُوم صرّاف، غلام نبی اونتو، سردار سنت سنگھ تیغ، محمد امین نحوی، محمد امین بٹ، اور دوسرے قابلِ ذکر ہیں۔

ان سبھوں کے اکٹھے ہونے سے نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ یقیناً خوفزدہ ہوگئی مولوی فاروق کے تین ساتھی عبدالرشید کابلی، سلیم انور دار اور صوفی احمد جنتا پارٹی میں شامل کیے گئے۔

اسی دوران مولوی فاروق دہلی روانہ ہوگئے، جہاں انھوں نے اپنے ایک اخباری بیان میں کہا:-

"جنتا پارٹی میں میری شمولیت کا سوال انتخاب کے بعد زیرِ غور آئے گا جنتا پارٹی کو عوامی الیکشن کمیٹی کی مکمل حمایت ملتی رہے گی، جموں و کشمیر اور نئی دہلی میں جو لوگ مجھے سٹیٹ جنتا پارٹی کی قیادت سنبھالنے کے لیے مسلسل اصرار کر رہے ہیں۔ میں ان پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی عہدہ یا منصب کا طالب نہیں میں کسی عہدے کے بغیر جنتا پارٹی کا اپنا بھرپور تعاون دے سکتا ہوں۔"

نیشنل کانفرنس نے ان پر الزام لگایا کہ مولوی فاروق دفعہ ۳۷۰ ختم کرنے کے لیے جن سنگھ سے ساز باز کر رہا ہے۔ ایسا ہی الزام انہوں نے مولانا محمد سعید مسعودی پر بھی لگایا نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے دفعہ ۳۷۰ کی رکھوالی کرنے کا الیکشن ایشو بنا لیا۔

رات بھیگی، راہ پیچیدہ، مسافر تشنہ کام
جا رہا ہے کس طرف یہ کاروانِ تیز گام

الیکشن مہم میں نیشنل کانفرنس کا ایک نیا اپروچ

مقامی جنتا پارٹی کو مرکزی سرکار کی مکمل حمایت حاصل ہے — اور یہ پارٹی یہاں اقتدار حاصل کر کے ہی رہے گی اس خیال نے نیشنل کانفرنس کے لیڈروں کو سخت اضطراب میں مبتلا کیا۔ ان کی برسوں کی عبادت صرف ڈھائی سال تک حکومت کرنے کے بعد ضائع ہو رہی تھی اور سیاسی میدان میں ان کو ہزیمت اٹھانا پڑ رہی تھی، اس خیال سے وہ سخت دِل برداشتہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ نیشنل کانفرنس کے بڑے لیڈر شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ کو دِل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے شیخ صاحب کو مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔



شیخ عبداللہ

شیخ صاحب کے دل کے دورے کا چرچا ہوا تو ان کے علاج کے لیے آل انڈیا میڈیکل سائنسز دہلی کے دو ممتاز ڈاکٹر مسٹر ایس کے بجاج اور مسٹر ایم، ایل، بھاٹیہ سرینگر بھیج دیئے گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر علی محمد جان اور ڈاکٹر غلام قادر علاقہ بند کے ہمراہ شیخ عبداللہ کا معائنہ کیا۔

نیشنل کانفرنس نے اپنے لیڈر کے دل کا یہ دورہ مخالفین کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

شیخ صاحب کے دل کے دورے کی خوب پبلسٹی کرائی گئی تاکہ اگر الیکشن میں ان کی ہار ہوئی تو انہیں کہنے کا موقع مل سکے کہ ہم الیکشن مہم لیڈر کے بغیر چلا نہ سکے اور ہماری غیر موجودگی کا اپوزیشن نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مرکزی سرکار اُن کی پُشت پناہی کر رہی تھی۔

دِل کے اس دورے کی پبلسٹی بڑی کارگر ثابت ہونے لگی تو ان کی صحت یابی کے لیے آستانوں اور خانقاہوں میں دعائیہ مجلسیں منعقد کی جانے لگیں، جگہ جگہ بھیڑ بکرے نذر کیے جانے لگے۔

مرزا محمد افضل بیگ، بیگم شیخ عبداللہ اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ شیخ صاحب کی صحت یابی کے لیے دعائیہ مجلسوں میں لوگوں کو جنتا پارٹی سے، جسے یہ لیڈر جن سنگھ کہا کرتے تھے لوگوں کو خبردار کرنے لگے۔


(بیگ)


(بیگم شیخ عبداللہ)


(فاروق عبداللہ)

مرزا محمد افضل بیگ عوامی اجتماع میں سبز رومال اور پاکستانی نمک کی ڈلی لے کر عوامی جلسوں میں اسکی نمائش کرا کر واضح الفاظ میں کہنے لگے:

"اب راولپنڈی کا راستہ زیادہ دُور نہیں ــــ برسرِ اقتدار آنے پر نیشنل کانفرنس اسمبلی میں ہندوستان سے علیحدگی کا ایک بل پیش کرے گی، نیشنل کانفرنس برسرِ اقتدار آتے ہی سب سے پہلے راولپنڈی روڈ کھول دے گی۔ نیشنل کانفرنس دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کرے گی۔ ہندوستان کو کوئی حق نہیں کہ وہ ہماری اندرونی خودمختاری میں دخل دے، اس پارٹی نے قوم سے جو وعدے کیے وہ پورا کرے گی"۔



نیشنل کانفرنس کی اس سیاسی مہم کو کانگریس نے نگڑم بازی سے تعبیر کیا اور کانگریس کے لیڈر سیّد میر قاسم نے اسلام آباد کے ڈاک بنگلہ میں کانگریسی کارکنوں کے اجتماع سے خطاب فرمایا:۔

شیخ عبداللہ کی عزّت و آبرو، مرزا افضل بیگ کی رائے شماری ــ غلام محیُ الدّین کا پاکستان ذاتی مفادات کے لیے ایک جنگ تھی ــ انہوں نے فرمایا:۔

"ہم اس بات کے ہرگز قائل نہیں کہ یہاں کے نہتے عوام کو فریب اور

دھوکے میں رکھ کر ان کے بنیادی حقوق کے ساتھ کھیلیں کانگریس نے ہمیشہ عوام کی خدمت کو ترجیح دی ہے اور ہم یہ خدمت برابر انجام دیتے رہے ہیں۔

کانگریس کو اپنی ساری غلطیوں کی سزا مل چکی ہے، اور ہم اپنے اعمال کو درست کر کے پھر قوم کی خدمت کرنے کے لیے اپنے آپ کو کمربستہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کانگریس کے ہاتھ پھر سے اقتدار آجائے گا ہم نے عوام کے مفاد کی خاطر شیخ محمد عبداللہ کو اقتدار سونپ دیا تھا لیکن انہوں نے اسے اپنے ذاتی مفاد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے کنبہ پروری رشوت خوری اور لُوٹ کھسوٹ کو فروغ دیا۔

شیخ عبداللہ کی عزّت و آبرو، بیگ صاحب کی رائے شماری اور محی الدین قرّہ کا پاکستان محض ذاتی مفادات کی تلاش کی خاطر ایک جنگ تھی اور یہ آج پھر ایکبار انہی مقاصد کے لیے لڑی جا رہی ہے۔

شیخ صاحب کے بڑھاپے کا لحاظ کر کے ہم نے ان سے اپیل کی تھی کہ وہ ہمیں خدمت کا موقع دیں لیکن شیخ صاحب کو اپنے بڑھاپے کا کوئی خیال نہیں وہ ۸۱ سال کی عمر میں بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتے ہیں شیخ صاحب ایک ناکام سیاستدان اور ناکام حکمراں ثابت ہوئے ہیں ان کی ناکامیوں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ شیخ صاحب ہماری جو مخالفت کرتے ہیں وہ صرف بانہال تک اپنا اثر رکھ سکتی ہے جبکہ انڈین نیشنل کانگریس پورے ملک خاص کر جموں کشمیر اور لداخ کی نمائندگی کا حق ادا چکی ہے اور ادا کر سکتی ہے۔

جنتا پارٹی چوں چوں کا ایک مربّہ ہے۔ اس جماعت پر جن سنگھ کا غلبہ ہے۔ جموں و کشمیر کی وحدت کو زبردست خطرہ ہے لہذا عوام کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ شیخ صاحب اور بیگ صاحب کا یہ نعرہ کہ ریاست کو ہند سے الگ کر دیا جائے گا، اب بہت فرسودہ ہو چکا ہے اور اس کا سارا اثر ۱۹۷۵ء میں زائل ہو چکا ہے ہم نے ان کے دفعہ ۳۷۰ کے دعوے دیکھے ہیں، عوام اتنے بے وقوف نہیں کہ وہ

بار بار اُن کے جھانسے میں آئیں۔

اِس نازک وقت میں کانگریس ہی ملک کو انتشار سے بچا سکتی ہے۔"

کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ساتھ جنتا پارٹی نے شیخ عبداللہ کی دھمکیوں اور اُن کی بلیک میلنگ کا سخت نوٹس لیا، چنانچہ پارٹی کے مقامی لیڈروں نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا:۔

"دفعہ ۳۷۰ کے مغالطے میں ہی آج تک شیخ عبداللہ کی بنا سپنی لیڈر شپ قائم رہی، اسی دفعہ کے تحت ریاست میں سالہا سال سے تنازعہ اور ٹکراؤ کے ماحول کو جنم دیکر اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینے کی ہوس نے پہلے بھی شیخ عبداللہ کو اصول شکنی پر مجبور کیا اور پھر اسی تناؤ اور ٹکراؤ کی صورت کو جنم دینے کے لیے دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت اور ضمانت کا ڈھونگ رچایا۔



(قائداعظم محمد علی جناح)

قائداعظم محمد علی جناح کی سیاسی پیشین گوئی کتنی صحیح نکلی کہ شیخ عبداللہ سیاسی موت مریں گے اور آج شیخ عبداللہ سیاسی موت مر چکے ہیں اس سے بڑھ کر سیاسی موت اور کیا ہو سکتی ہے کہ کل کے واحد لیڈر آج ممبر اسمبلی کے لیے لڑ رہے ہیں کیا پتہ اس ریاست کے گستاخ لوگ کیا کر بیٹھیں۔

دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کا دم بھرنے والے یہ بھول رہے ہیں کہ ۵، کا ایکارڈ کرتے وقت اس دفعہ کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس ایکارڈ کی رو سے شیخ صاحب نے گورنر کی مراعات اور تنخواہ مقرر کرنے اور الیکشن کے لیے ریاستی اسمبلی کے اختیارات صدر جمہوریہ ہند کو سونپ دیئے ہیں۔

کشمیر اسمبلی اگر کوئی قانون پاس کرنا چاہتی تو اُسے صدر مملکت کی منظوری حاصل کرنا پڑے گی، اس ایکارڈ کے بعد ریاست کے پاس قانون ساز کونسل توڑنے کا اختیار بھی صدر مملکت کو سونپ دیا گیا ہے۔

آئین ہند کی دفعہ ۳۶۸ کے تحت کشمیر ایکارڈ کے ذریعے ریاستی اسمبلی کے فیصلوں کو صدر جمہوریہ کی مرضی کے تابع رکھنے کے لیے ایک آرڈیننس جاری کرنے کے بعد دعویٰ کرنا کہ ہم دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کریں گے بھولے بھالے عوام کو صریحًا دھوکہ دینے والی بات ہے، دفعہ ۳۷۰ کی حالت آپ نے اس مکان کی جیسی بنا دی جس کی اندرونی ساری دیواریں ڈھائی گئی ہوں صرف بیرونی چار دیواریں کھڑی ہیں۔"

وادی بھر میں الیکشن مہم زوروں پر جاری تھی۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ زور شور سے ہو رہے تھے۔ نیشنل کانفرنس اور جنتا پارٹی کے جلسے اور جلوس تصادم کی صورت اختیار کر گئے۔ جنتا پارٹی نے جہاں کہیں جلسہ کا پروگرام رکھا تو اس کا توڑ کرنے کے لیے اگلے روز نیشنل کانفرنس نے یہاں اپنا اسٹیج کھڑا کیا۔

اس سلسلے میں اسلام آباد چوک میں جنتا پارٹی کے تحت بُلائے گئے ایک جلسہ میں اس پارٹی کے ایک لیڈر خواجہ غلام محی الدین قرّہ نے کثیر عوامی اجتماع سے خطاب فرمایا۔

"..... مرزا محمد افضل بیگ کے ۱۵ مئی کی اسی چوک میں کی گئی اُن کی تقریر جس میں انھوں نے فرمایا تھا۔ نیشنل کانفرنس کو ووٹ دینا "رائے شماری" کے برابر ہے، اور جیب سے سبز رومال نکال کر کہا "رائے شماری" کا مطلب آپ جانتے ہیں کیا ہے؟ — نیشنل کانفرنس یہاں کی واحد جماعت ہے جو یہاں کے لوگوں کی عزّت و آبرو کی ضمانت دے سکتی ہے جو دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت کر سکتی ہے اور راولپنڈی روڈ کھول سکتی ہے۔"

غلام محی الدین قرّہ نے بیگ صاحب کے بیان کے بارے میں کہا۔

"رائے شماری کا نعرہ دینے والے سیاسی ٹولے کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ سیاست سے سبکدوش ہو جائیں کیونکہ یہی وہ ٹولہ ہے جو رائے شماری کرانے میں سب سے بڑی رکاوٹ بن گیا۔

اس ٹولے نے ریاست میں کنبہ پروری، اقربا نوازی، لُوٹ کھسوٹ

جبر و ستم اور عوام کی بے حرمتی کا جو سلسلہ جاری رکھا، اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔ ۱۹۳۱ء سے لیکر ۱۹۷۷ء تک ان کی سیاسی جد و جہد کا حاصل ایک کرسی کی تلاش رہی ہے اور اپنے ذاتی اغراض کے حصول کی خاطر نام نہاد لیڈروں نے کبھی بھی قوم کے غم میں اپنے آپ کو بے چین نہیں رکھا بلکہ ۱۹۵۳ء میں اقتدار کی محرومی کے بعد "اقتدار کی واپسی" کا نشہ ان کے دماغوں پر سوار رہا آج یہ لوگ پھر کھوئے ہوئے اقتدار کو حاصل کرنے کے لیے کچھ جذباتی اور فرقہ وارانہ نعروں کو ہوا دے رہے ہیں۔ آج یہ لوگ پاکستان کو استعمال کر کے اپنے سیکولرزم کو بھی بھول رہے ہیں۔ جس سیکولرزم کے یہ بڑے دعویدار تھے۔

رائے شماری کا نعرہ دے کر ان لوگوں کا مقصد صرف ووٹ حاصل کر کے سلطان کشمیر بننا ہے لیکن ہم اور ہمارے غیور اور باغی جوان کسی شخص کو سلطان کشمیر بننے کی قطعاً اجازت نہیں دے سکتے، دفعہ ۳۷۰ کی تنسیخ کرنے والے قومی غداروں کو دفعہ ۳۷۰ کی رٹ لگانے کا کوئی حق نہیں کیونکہ انہی لوگوں نے اس دفعہ کو کھوکھلا کر دیا۔ اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے ان لوگوں نے لینڈ گرانٹس بل پیش کیا اس وقت دفعہ ۳۷۰ اور اس کی عصمت کا خیال کیوں نہیں ستایا دفعہ ۳۷۰ کی حفاظت وہ لوگ نہیں کر سکتے جنہوں نے ایک عدد نوکری کے لیے ریاستِ جموں و کشمیر کی سودے بازی کر کے ہماری آزادی کے ستون کو ہلا کر رکھ دیا۔

خواجہ غلام محی الدین قرہ کے بعد غلام محی الدین شال ایڈووکیٹ، ڈاکٹر عبدالمجید اور غلام رسول کوچک نے اپنی تقریروں میں لگ بھگ انہی خیالات کا اظہار کیا، البتہ انھوں نے اس میں مزید اتنا اضافہ کر دیا۔

"نیشنل کانفرنس اپنے دو سالہ دورِ حکومت میں ننگی ہو چکی ہے، اس نے اپنا اعتماد کھو دیا ہے اس لیے یہ جماعت دوبارہ اقتدار پر قابض نہیں ہو سکتی۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ کانگریس اور جنتا پارٹی نیشنل کانفرنس کا کچا چٹھا نکال کر ان کا ظاہر و باطن پبلک اجتماع میں اُجاگر کر رہے تھے، لیکن نیشنل کانفرنس کی حکمت عملی جو اوّل اور آخر دھوکہ اور فریب پر مبنی تھی بڑی کارگر ثابت ہونے لگی۔

وادیٔ کشمیر کے وہ لوگ جو بار بار اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے آئے ہیں ہم انسانی صورت کے بھیڑ اور بکریاں ہیں۔ ہم غیرت اور شعور سے بالکل مبرا ہیں۔ نیشنل کانفرنس کے جھانسے میں آ گئے، وہ اس انتخاب کو "رائے شماری یعنی پاکستان" کا تصوّر لے کر میدانِ کارزار میں کود پڑے جہاں انہیں راولپنڈی روڈ کھولنے کی بشارت دے کر پاکستان کے پرچم کے طور پر سبز رومال اور پاکستانی سرزمین کے طور پر پاکستانی نمک دکھایا گیا۔ تو انھوں نے جنتا پارٹی کو ہندوستان اور نیشنل کانفرنس کو پاکستان سمجھ کر رائے شماری کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھا۔

مرکز سے وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی، چرن سنگھ، ہیم وتی نندن بھوگنا، اٹل بہاری باجپئی، اور بابو جگجیون رام کی آمد نے عام لوگوں کو جنتا پارٹی سے متنفر کر دیا۔



(مرارجی ڈیسائی) چرن سنگھ بھوگنا

اسی دوران سبھرامنیم سوامی نے دفعہ ۳۷۰ اور بابو جگجیون رام نے سقوطِ ڈھاکا اور بنگلہ دیش کی فتح کا ذکر کیا تو کشمیری مسلمانوں نے اسے ایک چیلنج سمجھ لیا، مرارجی ڈیسائی کئی دیہات کا دورہ کرنے کے بعد سرینگر آئے تو مولوی فاروق نے انہیں میرواعظ منزل میں مدعو کیا، مولوی صاحب کے عقیدت مندوں نے وزیرِ اعظم مرارجی ڈیسائی کا لامثال استقبال کیا، عورتوں نے روایتی کشمیری وَن وُن میں ان سے مخاطب ہو کر گایا۔

"سبز دستار رس نبی چھوئی رأضی پاکستانک غازی آؤ"

(یعنی آپ کے سبز دستار پر نبی صلعم راضی ہیں، آپ یہاں پاکستان کے غازی آئے ہیں)

مولوی فاروق کے حامی سبز ہلالی پرچم لیے وزیرِ اعظم کا استقبال کر رہے تھے اور مرارجی ڈیسائی سبز پرچم کو پاکستانی پرچم سمجھ کر اندر ہی اندر کُڑھ رہے تھے۔

مولوی فاروق نے جب بیٹھک میں مرارجی ڈیسائی کو ایک خاص کرسی پر بٹھا دیا تو مولوی صاحب نے ان سے کہا۔

"اس کرسی پر کبھی قائد اعظم محمد علی جناح بیٹھتے ہیں"۔

مرارجی ڈیسائی نے دونوں ہاتھوں سے کرسی کو تھام کر طنزیہ انداز میں کہا:

"پھر تو ٹھیک ہے۔ میں جناح صاحب کی کرسی پر بیٹھا ہوں"۔

مرارجی ڈیسائی میرواعظ منزل میں جب داخل ہوئے تو ان کے باڈی گارڈ کے ہاتھ میں سُرخ ہریرہ کاغذ میں لپٹا ہوا ایک ڈبہ تھا جسے دیکھنے والے مٹھائی کا ڈبہ سمجھ بیٹھے، چنانچہ جناح صاحب کی کرسی پر بیٹھنے کے دوران جب مرارجی نے یہ ڈبہ مولوی صاحب کو پیش کیا تو مولوی صاحب نے اسے اپنے گھریلو نوکر کو اندر رکھنے کے لیے دینا چاہا۔

مرارجی ڈیسائی نے فوراً مولوی صاحب سے کہا اسے آپ اپنے پاس ہی رکھ لیجیے۔ یہ مٹھائی خاص آپ کے لیے ہے۔ مولوی صاحب کو اشتیاق ہوا انہوں نے ڈبہ کھولنا چاہا تو مرارجی نے انہیں پھر روک دیا اور کہا اسے آپ بعد میں بھی کھول سکتے ہیں۔ ایسی جلدی کیا ہے؟

مولوی صاحب اور مرارجی ڈیسائی کی یہ نوک جھونک دیکھنے والے بڑے محظوظ ہو رہے تھے۔

شری مرارجی ڈیسائی سرینگر کا دورہ مکمل کر کے دہلی گئے تو سرینگر میں اسلامی پرچم اور پاکستان کی گونج ان کا تعاقب کر رہی تھی، چنانچہ وہ پہلی فرصت میں سابقہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی سے ملنے اُن کی کوٹھی پر گئے، اور کشمیر کے بارے میں اُن سے مشورہ لینے لگے —!

مسز اندرا گاندھی نے مرارجی ڈیسائی کے سامنے واضح کر دیا کہ:

"کشمیر میں ہمارے لیے صرف شیخ محمد عبداللہ قابلِ اعتبار شخصیت ہیں ایک وہی شخص ہے جو وہاں ہندوستان کا رکھوالا ہے، وہ آپ سے اور مجھ سے کم ہندوستانی نہیں لہٰذا ان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی نہ کی جائے"۔

اس موقع پر مرارجی ڈیسائی نے مسز اندرا گاندھی سے کہا۔

"لیکن آج کل وہ اپنے ڈھنڈورچیوں کے ذریعے پاکستان کو خوب اُچھال رہے ہیں۔ راولپنڈی روڈ کھولنے کا پرچار کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ بھی کہلواتے ہیں کہ ہم الیکشن میں کامیاب ہوئے تو ہم بھارت کے ساتھ الحاق کو توڑ دیں گے"۔

مسز اندرا گاندھی نے جواب دیا:۔

"یہ سب الیکشن اسٹنٹ ہے اور کچھ نہیں ـــــ الحاق توڑنے اور راولپنڈی روڈ کھولنے کی بات ہی نہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ کشمیر اور پاکستان کے درمیان دیوارِ چین کھڑا کر سکتے ہیں۔

آپ شیخ عبداللہ پر بھروسہ کریں گے تو وہ آپ کے کام آ سکتا ہے۔ دفعہ ۳۷۰ بھی وہی ہٹا سکتے ہیں۔ اس کے بارے میں انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے"۔

ایسا سن کر مرارجی ڈیسائی بولے:۔

"میں نے بڑی غلطی کی جو میں آپ سے ملے بغیر کشمیر گیا میں تو وہاں سے گھاٹے کا سودا کر کے آیا ہوں"۔

۳۰ جون کو مولوی فاروق کی قیادت میں جامع مسجد سے لوگوں کا ایک بھاری جلوس نکل کر حضوری باغ میں اختتام پذیر ہوا، اس جلوس میں مولوی فاروق کے حامیوں نے شیخ عبداللہ کی بیماری کا ناٹک دکھا کر اُن کی ذات کی تذلیل کی اور الیکشن میں نیشنل کانفرنس کی ہار کی پیشگی اطلاع دی۔ بکروں کی اس حرکتِ نازیبا نے اُن لوگوں کو بھی نیشنل کانفرنس کی طرف مائل کر دیا جو اس تنظیم سے بدظن ہو کر خاموش تماشائی بننا چاہتے تھے۔

یکم جولائی کو نیشنل کانفرنس کا جوابی جلوس نکلا۔ اس میں مولوی فاروق اور بکروں کی خوب تذلیل کی گئی۔

انتخاب کے دن کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس کی آڑ میں پاکستان کو ووٹ دیئے۔ شیخ محمد عبداللہ کو اس فتح سے نیا جنم مل گیا۔

الیکشن کے دوران جن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں ۴ جولائی ۱۹۷۷ء کو انھیں پولوگراؤنڈ لوگوں کے درشن کے لیے لایا گیا۔

۷ جولائی کو انھوں نے اسی پولوگراؤنڈ میں عوامی اجتماع کے سامنے نحیف آواز میں فرمایا :-

عوام کی دعاؤں کے طفیل مجھے نئی زندگی ملی، اس کے لیے میں اپنی اور اپنے خاندان کی طرف سے عوام کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اس کے بعد انھوں نے کلام پاک کی تلاوت کی اور اقبال کے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

باب ۲

نیشنل کانفرنس کا دورِ حکومت

عوام مایوسی کے شکار
خاندانی راج کا چلن

شعلوں کی حکومت ہے چمن زیر و زبر ہے
ہم نے جو لگایا تھا شجر اس کا ثمر ہے

•

THE UNIVERSITY OF MICHIGAN

جُز

صفحہ نمبر

۱۔ نیشنل کانفرنس کی حکومت نئی وزارت کے ساتھ عوام کی توقعات ۸۱

۲۔ ریاست میں جنتا پارٹی کا زوال عوام پر حکومت کے "سیفٹی ایکٹ" کا وار ۸۷

۳۔ راشن پر سبسڈی کی منسوخی سرمایہ داروں کے لیے سبسڈی کی بحالی ۹۹

۴۔ مرزا افضل بیگ کا وزارت اور تنظیم سے اخراج ۱۱۱

۵۔ ریاستی حکومت پر اپوزیشن کی یلغار جموں، کشمیر اور لداخ میں حالات مخدوش ۱۲۵

۶۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا کشمیر پر اثر فوجی ٹولہ کی مارکٹائی، جمعیت طلباء کا ایجی ٹیشن ۱۳۷

۷۔ شیخ محمد عبداللہ کی اہلِ خانہ کے ہمراہ زیارت کے لیے روانگی اور واپسی ۱۴۹

نیک ناموں نے ڈبودی ناؤ تنگ و نام کی
اور جو بدنام تھے۔ بدنام ہی رہتے رہے

نیشنل کانفرنس کی حکومت

نئی وزارت سے عوام کی توقعات

مرکز میں جنتا پارٹی کے دورِ حکومت میں کشمیری عوام نے نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ کو بھاری اکثریت سے فتح دلائی۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک ان رہنماؤں کے کارناموں کو دیکھا جائے تو یہ عوام کی طرف سے مسترد ہونے کے قابل تھے، چونکہ کشمیری مسلمانوں کی بیشتر آبادی عقل و شعور اور غیرت کے بجائے جذبات سے کام لیتی ہے، اور الیکشن کے موقعوں پر سبز رومال، پاکستانی نمک دیکھ کر راولپنڈی کی آس میں، رائے شماری، پر عملی جامہ پہناتی ہے اور اس طرح نیشنل کانفرنس لیڈرشپ کے ہاتھوں ایک دو بار نہیں بلکہ بار بار دھوکا کھاتی آئی ہے۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈرشپ نے عوام کو جتنا زیادہ دھوکا اور فریب دیا اس سے جوں زیادہ عوام نے انھیں پیار اور اعتماد دیا۔


شیخ عبداللہ

۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک شیخ عبداللہ کی وزارت ست کی معیشت سدھارنے کے بجائے ریاست کے مستقبل بھیلوں اور سازشوں میں گزری۔

۱۹۷۵ء کے ایکارڈ کے بعد دوبارہ حکمراں بن گئے تو وہ گریس کے رحم و کرم پر رہ کر کوئی ٹھوس کام نہ کر سکے ڈھائی ل کا عرصہ کانگریسیوں کے ناز نخرے اُٹھانے میں صرف ہوگیا۔ جولائی ۱۹۷۷ء میں عوام نے انہیں بلا شرکتِ غیرے

مسندِ وزارت پر ایسا بٹھا دیا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکا۔

اگر یہ کہا جائے کہ برسوں کی جد وجہد کے بعد پہلی بار ۱۹۷۷ء میں شیخ محمد عبداللہ حقیقی معنوں میں حکمراں بن گئے تو غلط نہیں ہوگا۔ عوام کے لیے کچھ کر گزرنے کے لیے اگر ان کے دل میں کوئی چاہت تھی تو ان کو پورا کرنا اب ان کے بس میں تھا۔ "نیا کشمیر کا خواب" تعبیر کے روپ میں پیش کرنے کے لیے اب وہ پوری استطاعت رکھتے تھے۔ کشمیری عوام نے اپنا تن، من اور دھن دے کر شیخ عبداللہ کو جس غرض وغایت کے لیے اپنا رہنما اپنا قائد اور اپنا حاکم مانا تھا وہ غرض وغایت پورا کرنے کی گھڑی اب آگئی تھی۔

آج شیخ محمد عبداللہ کشمیری عوام کا ایک ایسا حکمراں بن کر آیا تھا جس کے پیچھے عوامی طاقت تھی اور عوامی طاقت دنیا کی سب سے بڑی قوت مانی جاتی ہے۔

کشمیری عوام نے شیخ عبداللہ کو سر آنکھوں پر بٹھا دیا انہیں اپنی بھرپور محبت دی، ان کا بے حد احترام کیا اور انہیں اپنے کتنے ہی حسین وجمیل خوابوں کی تعبیر سمجھ بیٹھے۔

شیخ محمد عبداللہ آج پھر ریاست جموں وکشمیر کے حاکم اعلیٰ بنے — یہ وہی شخصیت تھی جسے کشمیر کے سیاسی افق پر نمودار ہوتے ہی ڈوگرہ شاہی نے باغی قرار دیا، لیکن قوم نے اپنے باغی عبداللہ کو "شیر" کا خطاب دے کر انہیں 'شیرِ کشمیر' کے نام سے پکارا، اور اس شیر کی دہاڑ نے کاخِ اُمرا، کے دَر ودیوار ہلا دیئے۔

صدیوں کے بعد یہاں کے دبے اور کچلے عوام نے ایک کشمیری جوان کو یہاں کی مطلق العنان حکومت کے ظلم واستبداد کو للکارتے ہوئے دیکھا تو قوم نے انھیں خدا کا نازل کردہ کرشمہ سمجھا اور ان کے بارے میں ایسی باتیں منسوب ہوگئیں کہ وہ انسانی پیکر میں ایک عجوبہ بھی بن گئے۔ ان کے تئیں عوام کی اتنی عقیدت بڑھ گئی کہ وہ ما فوق الفطرت شئے بن گئے۔

عوام کی سادگی کا فائدہ اٹھا کر "زرینہ گیرِ آب پھیرِ، صورِ منزلال نیرِ" کی من گھڑت پیش گوئی پھیلائی گئی۔ اس کے بعد یہ افواہ اُڑائی گئی کہ مہاراجہ نے شیخ عبداللہ کو تیل کی ایک کڑکتی ہوئی کڑھائی میں اترنے کو کہا تو شیخ عبداللہ نے اس میں ہاتھ ڈال کر تیل کو

ٹھنڈا کر دیا۔ مہاراجہ یہ حال دیکھ کر شیخ عبداللہ سے ڈر گئے۔

کچھ مدت کے بعد مولوی بشیر احمد کی طرف سے درختوں کے پتوں پر تیزاب سے 'شیرِ کشمیر' لکھ کر اس پبلسٹی سے عوام کا دل بہلایا گیا۔

ان توہماتی مفروضات سے پہلے یہ افواہ بھی پھیلائی گئی کہ جن دنوں شیخ صاحب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ قلعہ ہاری پربت میں قیدی تھے تو صبح سویرے ایک شیر یہاں آکر دہاڑتا تھا۔

شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ نہ تو توہماتی اور نہ ہی معجزاتی کردار تھے، بلکہ ایک انسانی نفسیات کے حامل سیاسی لیڈر تھے، جن کے تئیں توہماتی مفروضات پر مبنی افواہیں پھیلا کر ایک مخصوص گروپ سادہ لوح کشمیری عوام کو جہالت کی طرف دھکیلنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس مخصوص گروپ کے وقفہ وقفہ کے بعد شیخ صاحب کے بارے میں معجزاتی افواہیں پھیلانے کا کام پہلے پہل مسلم قائدین اور پھر نیشنل کانفرنس بن جانے کے بعد انڈین نیشنل کانگریس نے انجام دیا۔

مسلم قائدین عوام کے سامنے شیخ عبداللہ کی سحر بیانی کا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے اور کانگریس کا بس یہی ایک مقصد تھا شیخ عبداللہ کو کسی طرح پچھلی صف سے لاکر اگلی صف میں کھڑا کر دیا جائے اور اگلی صف میں ان سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے ان سے پہلے ہی ہندو پیماں ہو چکا ہے۔

ان توہماتی مفروضات پر مبنی افواہوں سے شیخ صاحب کی ہمہ گیر مقبولیت میں اضافہ ہوا لیکن کشمیری عوام کو اپنے رہنما کی اصلیت اور ان کی افادیت سمجھنے میں بڑی زبردست رکاوٹ غلطیاں سرزد ہوئیں۔

شیخ عبداللہ نے اپنی پُرعزم اور مجاہدانہ قیادت سے کچھ ہی برسوں میں جہاں ریاست کے بیشتر مسلمانوں کو اپنے گرد منظم کیا وہاں ڈوگرہ شاہی ان کے عزائم کو کمزور کرنے کے لیے کمربستہ ہوگئی۔

شیخ محمد عبداللہ نے فرقہ وارانہ بھائی چارے اور قومی رواداری پر اپنی ولولہ انگیز تقریر سے نہ صرف ریاست کے غیر مسلم عوام میں بلکہ ہندوستان کے سوشلسٹ اور سیکولر

THE UNIVERSITY OF MICHIGAN LIBRARY

حلقوں میں اپنا ایک مقام بنالیا، محب وطن دانشور بھی ان کے گرد جمع ہوگئے۔

انہوں نے آزادی کی لڑائی میں عدم تشدد کا پرچار کرکے "کشمیر کا گاندھی" کا خطاب بھی حاصل کرلیا۔

۱۹۴۲ء کے اوائل میں انھوں نے "نیا کشمیر" کا سوشلسٹ پروگرام اپنا نصب العین بناکر پیش کرکے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالدیا۔

"نیا کشمیر" کا پروگرام پیش کرکے نیشنل کانفرنس اور اس کی لیڈرشپ دنیا کی نظروں میں اُجاگر ہوگئی۔

"نیا کشمیر" کا پروگرام عوام کے سامنے پیش کرتے ہوئے شیخ صاحب نے فرمایا تھا:

"ہمیں وہ شخصی راج کسی بھی صورت میں منظور نہیں جو راج
وراثت میں باپ کے بعد بیٹے کو ملتا ہے چاہے یہ بیٹا نالائق
اور ناقابل قبول ہی کیوں نہ ہو۔"

شیخ محمد عبداللہ نے جاگیرداری کا خاتمہ، چک داری سسٹم کی منسوخی اور زمیندار کے چنگل سے کاشت کار کو آزادی دلانے کا نہ صرف اپنا عزم دہرایا بلکہ اس پر عملی جامہ بھی پہنا دیا۔ چنانچہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں عوام نے انہیں وہ ساری طاقت لوٹادی جس کی بدولت وہ عوام کے برسوں کے خوابوں کی تعبیر میں بدل سکیں۔

شیخ محمد عبداللہ ریاست جموں وکشمیر کے بلاشرکت غیرے وزیراعلیٰ بن گئے تو پہلے ہی مرحلے پر انہوں نے ایک جھوٹی غریب اور پسماندہ ریاست پر پورے ۲۴ منسٹروں کا بھاری بوجھ ڈالدیا۔ یہ ایک ایسا بوجھ تھا جس سے اس ریاست کی معیشت کی کمر ٹیڑھی ہوگئی۔ ریاست جہاں صرف دس بارہ منسٹروں کا بار مشکل سے سہہ لیتی وہاں پورے ۲۴ منسٹروں کا بار اس پر ڈال دیا گیا۔

وزارت کی تشکیل کے بعد وزیراعلیٰ کی سربراہی میں اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو گورنر ایل کے جھانے دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں جنتا پارٹی کے دور میں ہوئے حالیہ الیکشن کو پاک وصاف کی سرٹیفکیٹ دے کر اس سے قبل کے انتخابات کو اشارتاً ایک فراڈ سے تعبیر کیا اس طرح گورنر نے اسمبلی کے ذریعے بھارت کے ساتھ ریاست کے الحاق کو مشکوک بنا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جنتا دور حکومت کے اس الیکشن کو مکمل پاک وصاف ہرگز نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ الیکشن کے دن پولنگ بوتھوں پر قبضہ اور غیر نیشنلسٹ ایجنٹوں کا اغوا اور مسلموں کو پولنگ بوتھوں تک آنے سے روکنا۔ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، ووٹ صندوقوں کو اڑانے یا بدلنے، کاؤنٹنگ ہال میں دھاندلی کرنے اور ناکام امیدواروں کو کامیاب بنانے تک تو یہ انتخابات یقیناً صاف ستھرے تھے، لیکن مکمل پاک وصاف نہیں تھے۔

۱۹۵۰ء سے لیکر اب تک کے تمام انتخابات کے مقابلے میں بہت حد تک غنیمت تھے۔ اسمبلی میں گورنر کے ایڈریس پر شکریے کی تحریک کے دوران جماعت اسلامی کے واحد ممبر اسمبلی سید علی شاہ گیلانی نے اس الیکشن کا یوں تجزیہ کیا۔

"حالیہ انتخابات میں نیشنل کانفرنس کو جو اکثریت حاصل ہوگئی ہے یہ نیشنل کانفرنس کے حق میں ہندوستان کی نفرت کا ووٹ تھا جس کو لوگوں کے جذبات اُبھار کر حاصل کرلیا گیا ہے۔ الیکشن کے موقع پر نیشنل کانفرنس کی عام طور پر یہ پالیسی رہتی ہے کہ وہ اپنی پارٹی کو ہندوستان کی بدترین مخالف اور دشمن کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور یہ باور کراتی ہے کہ صرف ہم ہندوستان کی جارحیت کا مقابلہ کرسکتے ہیں اور کشمیری قوم کے تشخص کا تحفظ کرسکتے ہیں کوئی اور پارٹی یا جماعت اس فریضہ کو انجام نہیں دے سکتی اور لوگ بڑی آسانی کے ساتھ اس بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ اس میں شخصیت پرستی کے سوقیانہ جذبات کا بھی بڑا عمل دخل ہے اور لوگوں کے ذہنی اور علمی بے مائیگی بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔"

اسی اجلاس کے دوران گیلانی صاحب نے وزیراعلیٰ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

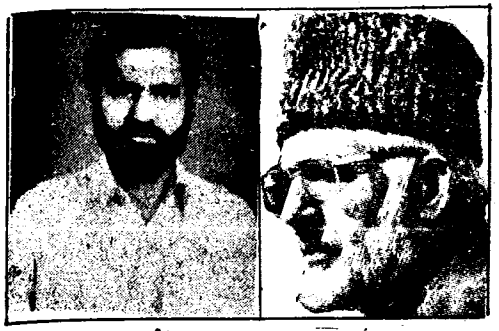
"برصغیر ہندوپاک میں ملت اسلامیہ جن عظیم نقصانات سے دوچار ہوتی ہے ان کی تمام تر ذمہ داری صرف آپ اور آپ کی ذات پر عائد ہوتی ہے۔"

دورانِ سیشن اسمبلی میں سید علی گیلانی اور عبدالغنی لون نے ۱۹۵۳ء کی بحالی،

نیشنل کانفرنس نے عوامی اجتماعات میں واضح کردیا تھا کہ اگر ہم انتخاب جیت گئے تو اسمبلی میں ہندوستان کے ساتھ علیحدگی کا بل پیش کیا جائے گا۔"

THE UNIVERSITY OF MICHIGAN LIBRARIES

صدرِ ریاست اور وزیرِ اعظم کے عہدوں کی بحالی کی ایک بل منظوری کے لیے پیش کی۔



سید علی شاہ گیلانی۔ عبدالغنی لون

اصولی طور پر یہ بل نیشنل کانفرنس کی طرف سے پیش ہونی چاہیے تھی اور اسے قائد ایوان کی منظوری سے بھاری اکثریت سے پاس بھی ہونا تھا۔ کیونکہ یہ نیشنل کانفرنس کے منشور میں درج تھا اور الیکشن کے دوران اس پارٹی کے لیڈروں کا عوام سے ایک عہد بھی تھا۔ برعکس اس کے قائد ایوان اور نیشنل کانفرنس کے ممبران کی طرف سے اس بل کی نہ صرف مخالفت کی گئی بلکہ اس بل کو پیش کرنے کا موقع بھی فراہم نہیں کیا گیا۔ عبدالغنی لون اور سید علی شاہ گیلانی کو اس بل کے ذریعے فتنہ جگانے کا الزام لگا کر انہیں نہ صرف دھمکی دی گئی بلکہ ان کے خلاف زور زبردستی کا مظاہرہ بھی کیا گیا ان دونوں ممبران اسمبلی کی اسمبلی ہال میں ضرور مار پیٹ کی گئی، لیکن انہوں نے نیشنل کانفرنس کے منشور اور عوام سے کیے گئے عہد و پیمان کے بارے میں نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کے تمام کپڑے اتار کر انھیں اسمبلی میں ننگا کر کے رکھ دیا۔

اگر کشمیر میں انسانی شکل و صورت کی بھیڑ بکریوں کی تعداد بہت زیادہ نہ ہوتی تو انھیں اپنے لیڈر اور رہنما کبھی بھی کپڑوں میں نظر نہیں آتے، اور نہ ہی فریب دھوکہ اور جھوٹ کا پردہ اُٹھنے کے بعد انہیں بحیثیت حکمراں قبول کر لیتے۔

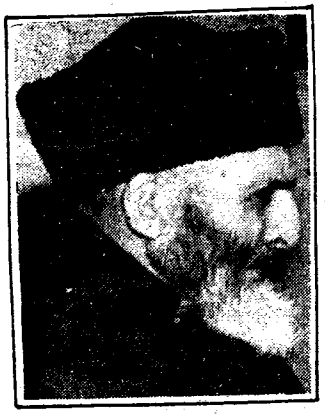
لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے، جہاں جیسے لوگ ہوتے ہیں ان کو ویسے ہی حاکم بھی ملتے ہیں۔ کشمیری عوام پر بالکل صادق آتا ہے۔

میری پیدائش کا تم سمجھے نہیں ہو مدعا
آگیا ہوں زندگانی کو مٹانے کے لیے

ریاست میں جنتا پارٹی کا زوال

عوام پر حکومت کے "سیفٹی ایکٹ" کا وار

کشمیر کا جنتا یونٹ انتخابات میں شکست کھانے کے بعد ایک طرف مرکزی سرکار کی ی سے برہم ہوا۔ دوسری طرف اس شکست کا مورد الزام اس کے کنوینر مولانا محمد سعید مسعودی ہرایا گیا۔ مولانا مسعودی پر سازش کر کے جنتا پارٹی کو ڈبونے کا جو الزام لگایا گیا۔ وہ اگرچہ ں دار تھا۔ لیکن سوائے چودھری محمد شفیع کے اور کوئی اس راز سے واقف نہیں تھا کہ مولانا دی کو پوشیدہ طور پر شیخ صاحب کے ساتھ (UNDER STANDING) تھی اور ے لئے انھیں مرکز کی ہدایت بھی تھی۔ مرزا افضل بیگ نے خود میرے سامنے اس بات کا اعتراف ے۔ "مجھے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ مولانا جنتا پارٹی



(مولانا محمد سعید مسعودی)

یر کی حیثیت میں ہمارے لئے کام کر رہے ہیں اور میں صاحب سے کہہ بھی دیا تھا۔ ان پر بھروسہ کم کرنا چاہیئے' د میں مجھے اُن کے بارے میں اپنا نظریہ بدلنا پڑا۔ خ صاحب کو دیکھئے کتنے بے مروت ہیں میری طرح ے ساتھ بھی کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ (ان دنوں بیگ تنظیم اور وزارت سے نکالے گئے تھے)"

مولانا محمد سعید سے گاندربل میں ایک ملاقات کے جب میں نے اُن سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا ں نے اس کا گول مول جواب دیا۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ چونکہ آپ ابتدا سے تحریک

کے ساتھ رہے ہیں۔ لہٰذا آپ نے اس تحریک کے بارے میں ضرور لکھا ہوگا۔ انھوں نے اقرار کیا اور بتایا ہاں! کچھ نوٹس قلمبند کر کے رکھے ہیں لیکن وہ یہاں میرے پاس نہیں ہیں۔

مولوی صاحب ہسپتال میں جب زیر اعلاج تھے تو مجھے ان کے ضروری نوٹس کی فکر ہوئی۔ میں نے ان کے چھوٹے بھائی نذیر احمد مسعودی سے پوچھا تو انھوں نے مجھے بتایا۔ میرا خیال ہے انھوں نے کشمیر کی سیاست پر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ چودھری محمد شفیع کے پاس دہلی میں رکھا ہے۔

"کشمیر کا سیاسی انقلاب" کے سلسلے میں مجھے کتنی بار دہلی جانا پڑا تو میں نے چودھری صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے مسعودی صاحب کے کاغذات رکھنے سے انکار کیا۔ البتہ اس بات کا اقرار کر لیا کہ جنتا دورِ حکومت میں ہم نے ریاست میں نیشنل کانفرنس کا خفیہ طور پہ بھرپور ساتھ دیا۔



(چودھری محمد شفیع)

"یہ ساتھ آپ نے کیسے دیا۔؟" میں نے پوچھا۔

"جب ہمیں پتہ چلا کہ جنتا پارٹی ریاست میں برسر اقتدار آنے پر مرکزی سرکار کی کٹھ پتلی بنے گی اور یہ کشمیر کی انفرادیت ختم کرنے کے لئے ہمیں استعمال کرے گی تو ہم نے نیشنل کانفرنس کا ساتھ دینا شروع کیا۔"

"ہاں! تو یہ ساتھ کیسے ۔۔۔ کس طرح دیا؟"

"مرکزی سرکار نے انتخابات کے دوران پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنے سے روکنے کے لئے جو ڈو ٹالین سی۔ آر۔ پی۔ ایف بھیجی تھی۔ اس کو پولنگ بوتھوں پر بھیجنے کے بجائے بارکوں میں رکھنے کا فیصلہ لیا گیا تاکہ نیشنل کانفرنس کو پولنگ بوتھوں پر قبضہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آسکے۔ بیشتر پولنگ بوتھوں پر ہمارے ایجنٹوں کے اغوا کی شکایات کا ہم نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ جنتا پارٹی کے سبھی مقامی لیڈر اس بات پر زور ڈال رہے تھے کہ انتخابات میں وہی پرانا طریقہ آزمانا چاہیئے جواب تک یہاں آزمایا جارہا تھا۔ لیکن کنوینر صاحب نے ان کو بتایا۔ وزیر اعظم نے ایسا کرنے کی مناہی کر دی ہے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو لینے کے دینے پڑیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مرکز کو ریاست میں جنتا پارٹی کے جیتنے میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ کیونکہ مسز اندرا گاندھی نے اس بارے میں خطرے کی گھنٹی بجائی تھی۔

اسمبلی انتخابات میں شکست کھانے کے بعد وادی کے جنتا لیڈروں جن میں مولانا محمد فاروقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان پر نیشنل کانفرنس کے حامیوں نے ایسا زلہ اُتارا کہ انھیں کئی دنوں

تک اپنے عیال کے ساتھ گوشہ نشین رہنا پڑا۔ ان کے علاوہ غلام محی الدین قرہ، افتخار حسین انصاری، نعیم احمد شمیم، جی۔ ایم۔ باون، غلام نبی خیال، پیرزادہ علی شاہ، محمد امین بٹ اور دوسرے شہر سرینگر کے جنتا لیڈروں کے گھروں پر نہ صرف پتھراؤ کیا گیا بلکہ غلیظ گالیوں سے ان کے جذبات مجروح کئے گئے۔

نیشنل کانفرنس کے حمائیتوں کے ہاتھوں مقامی جنتا لیڈروں کی درگت اور اس پر جنتا سرکار کی سرد مہری نے وادی کی جنتا پارٹی کو سخت بیزار کر دیا اور وہ آہستہ آہستہ اس پارٹی سے کنارہ کش ہونے لگے۔

سرینگر سے جنتا پارٹی کے مرکزی دفتر سے بذریعہ پولیس جنتا لیڈروں کو بے دخل کرنے اور یہاں کا سارا ریکارڈ توڑ پھوڑ کر دینے کے بعد جنتا کے مقامی لیڈر ایک طرح سے روپوش ہوگئے وادی کے جنتا پارٹی کے لیڈروں کو نیشنل کانفرنس کے رحم وکرم پر چھوڑ کر مرکزی سرکار نے جو رول ادا کیا۔ اس سے وادی کا جنتا یونٹ بکھر کر رہ گیا۔

ایک مدت تک پوشیدہ رہنے کے بعد جب حالات رفتہ رفتہ نارمل ہونے لگے۔ تو کئی مقامی لیڈروں نے کنوینر مولانا مسعودی سے شکایت کی نیشنل کانفرنس کے حمایتی پولیس کی مدد سے ہمارے ساتھ جو سلوک کر رہے ہیں۔ اگر فوری طور اس کا تدارک نہیں کیا گیا تو ہم کشمیر سے ترکِ وطن کریں گے۔

مولانا مسعودی نے جنتا لیڈروں اور ورکروں سے دستخط شدہ ایک میمورنڈم لے کر مرکزی سرکار کو بھیجا دیا، اس میمورنڈم میں صاف صاف لکھا گیا تھا کہ اگر ہمارا یہاں تحفظ نہیں ہوسکتا تو ہمیں کسی اور ریاست میں بسایا جائے۔

اس میمورنڈم پر مرکزی ہوم منسٹری نے سخت نوٹ لکھ کر وزیر اعلیٰ کو متنبہ کیا کہ اگر ان حالات کو روکا نہیں گیا تو مرکز کو مداخلت کرنا پڑے گی اور گورنر سے کہنا پڑے گا کہ وہ عوام کو تحفظ فراہم کرے۔

مرکزی ہوم منسٹری نے جس لہجے میں وزیر اعلیٰ سے جنتا پارٹی کے لیڈروں اور ورکروں کو ستانے سے باز آنے کی دھمکی دی تھی۔ اس میں گورنر راج نافذ کرنے کی بُو سونگھ کر شیخ صاحب کے پاؤں تلے زمین سرکنے لگی۔

انھوں نے جنتا سرکار کی ناراضگی دور کرنے کے لئے ۱۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو مرکزی سرکار کو ایک خط لکھ کر جہاں مقامی جنتا لیڈروں کی شکایات کو غلط قرار دیا۔ وہاں اپنی وفاداری کا یقین دلانے

ہوئے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کردی۔

"جموں وکشمیر کے "آزاد کشمیر" حصّے کو کسی مزید تاخیر کے بغیر پاکستان کے قبضے سے آزاد کردیا جائے، موجودہ کنٹرول لائن ایک غیر قدرتی لائن ہے جس سے بہت سارے مسائل پیدا ہوگئے ہیں۔"

اِس خط کے جواب میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۸ء کو مسٹر اٹل بہاری باجپائی نے شیخ صاحب کو لکھ دیا:

"..... شیخ صاحب کو محسوس کرنا چاہیئے کہ "آزاد کشمیر" کو آزاد کرانے کے لئے انڈیا کو جو جنگ لڑنی ہوگی۔ اس کے دور رس نتائج نکل سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ کئی ممالک مقبوضہ کشمیر کو پاکستان کا ایسا ہی حصّہ تصور کرتے ہیں جیسا کہ وہ کشمیر کے اِس حصّے کو ہندوستان کا حصّہ مانتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مقبوضہ کشمیر پر چڑھائی کرنے سے ایک مردہ سوال پھر زندہ ہوسکتا ہے اور موجودہ حالات میں یہ آبیل مجھے مار والی بات ہوگی۔

ہم آپ کے جذبات کی قدر کرتے ہیں لیکن ہم اس ملک کو کسی جنگ میں اُلجھانا نہیں چاہتے ہیں۔ جب جنگ کے ذریعے یہ کام ہوسکتا تھا۔ اس وقت آپ ہی اس میں رکاوٹ بن گئے۔ آپ ہی نے پہلے پنڈت نہرو اور پھر مسز اندرا گاندھی کو مقبوضہ کشمیر پر قبضہ کرنے سے روکا۔!

ہم امن کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ دونوں پڑوسی ممالک امن کے ماحول میں اپنے اپنے عوام کی خدمت کرسکیں!"

پاکستان کے جنگل سے "آزاد کشمیر" کو چھڑالانے میں وزیر اعلیٰ کا جو مقصد تھا۔ کسی حد تک پورا ہوا، اس طرح اُنھوں نے ہندوستانی رہنماؤں کو اپنی وفاداری اور ہندوستان نوازی کی سند پیش کی، اس سند پر تصدیقی مہر لگانے کے لئے اُنھوں نے مارچ میں چندی گڈھ کے دورے کے دوران اخباری نمائندوں کو بتایا۔

"ہند کے ساتھ کشمیر کا الحاق ناقابلِ تنسیخ ہے اور یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ کشمیر کے کسی ایک حصّے نے نہیں بلکہ پوری ریاست نے ہند کے ساتھ الحاق کیا ہے۔ پاکستان "آزاد کشمیر" پر ناجائز قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ میں نے مرکزی سرکار کو مشورہ

دیا ہے کہ وہ "آزاد کشمیر" کو پاکستان سے چھڑالائیں۔"

سرینگر میں قانون ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو گورنر کے ایڈریس پر شکریہ کی تحریک کی ابتدا کرتے ہوئے اُنھوں نے یہ بات واضح کردی کہ.....

"جموں وکشمیر کے ایک حصّے پر پاکستان کے تسلّط سے جو حالات پیدا ہوئے ہیں ان سے ہمیں زبردست مشکلات کا سامنا ہو رہا ہے۔ ریاستی حکومت مرکزی سرکار سے درخواست کرچکی ہے کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ڈھونڈا جائے، کشمیر پر پاکستانی حملے کے وقت ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی کا جو فیصلہ کیا گیا وہ صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا جس وقت جنگ بندی کا فیصلہ کیا گیا ہماری فوجیں مظفر آباد اور کوٹلی تک پہنچ چکی تھیں۔ اگر جنگ بندی کا فیصلہ نہ کیا گیا ہوتا تو ہم نے ریاست کے تمام علاقوں کو پاکستان کے قبضے سے آزاد کرالیا ہوتا۔"

کشمیر اسمبلی میں وزیر اعلیٰ کے اس بیان پر عوامی حلقوں میں کافی لے دے ہوئی، وہ لوگ یقیناً حیران ہوں گے جو پاکستان کے نام پر نیشنل کانفرنس کو ووٹ دے کر راولپنڈی روڈ پر لے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔

الیکشن مہم کے دوران جو لیڈر عوام سے کہہ رہے تھے۔ اگر ہم انتخاب جیت گئے تو اسمبلی میں ہندوستان سے ریاست کو علیٰحدہ کرنے کا بل پیش کریں گے۔ جب وہ اس اسمبلی سے الحاق کو ناقابلِ تنسیخ اور پاکستان کے چُنگل سے "آزاد کشمیر" کو چھڑالانے کی باتیں سُننے لگے تو اُنھوں نے اپنے آپ کا جائزہ لے کر اس بات کی ضرور تصدیق کی ہوگی۔ ہم ایسے بے غیرت اور بے شعور لوگ ہیں جو بار بار دھوکے میں آتے ہیں۔

نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ نے الحاق کو ناقابلِ تنسیخ مان کر اور "آزاد کشمیر" کو پاکستان کے چُنگل سے چھڑانے کا منشور لے کر الیکشن لڑا ہوتا تو یہ سب کچھ ہرگز قابلِ اعتراض اور قابلِ گرفت نہ ہوتا۔

بھولے بھالے کشمیری عوام سے پاکستان کے نام پر ووٹ لے کر ہندوستان کے گیت گانا قابلِ اعتراض اور قابلِ افسوس بات ہے۔ میرا خیال ہے ایسی دوغلی پالیسی سے وہ بھی خوش ہوں گے جن کے یہ آج گیت گا رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ نے حضرتِ انسان کو ضمیر کے نام سے ایک انمول تحفہ دیا ہے۔ جس کے پاس ضمیر نہیں

اس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ انسان اور حیوان میں یہی ایک بہت بڑا فرق ہے کہ انسان کے پاس ضمیر نام کے ایک انمول شئے ہے اس شئے سے حیوان بالکل محروم ہے۔

کشمیر اسمبلی میں وزیر اعلیٰ کے اس بیان پر بعض عوامی حلقوں میں ضرورے دے ہوئی۔ مگر وہ ممبران اسمبلی جنہوں نے میڈیٹ کے عوض شاید اپنی غیرت اور ضمیر نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کے پاس گروی رکھدی تھی۔ اُف تک نہ کر سکے۔ محض اسمبلی کی ممبری اور وزارت کے عہدے کی خاطر اُن کی خاموش ضمیر فروشی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ دراصل وادی کشمیر میں ضمیر کی آواز پر اسمبلی کی ممبری یا وزارت سے استعفےٰ دینے کا اس لئے کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ جب ضمیر ہی نہیں تو ضمیر کی آواز کیسی؟ نیشنل کانفرنس کی تاریخ میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی جب اس تنظیم کے ایک ادنیٰ کارکن سے لے کر اعلیٰ عہدیدار تک کسی ایک نے بھی ضمیر کی آواز پر اس تنظیم سے علیحدگی اختیار کی ہو، یا لیڈر شپ سے کسی بات پر باز پرس کی ہو، حد تو یہ ہے کہ انھوں نے اُس وقت بھی ایک آہ تک نہ بھری جب لیڈر شپ نے ریاستی عوام پر ایک بھرپور وار کیا۔

انھوں نے عوام کی عزت و آبرو بحال کرنے کا جو وعدہ کیا تھا اس کو پبلک سیفٹی ایکٹ نافذ کر کے پورا کیا۔

پبلک سیفٹی آرڈی نینس

ریاست جموں وکشمیر کے عوام نے شیخ محمد عبداللہ کو حکمرانی کی بحالی کے لئے جو قربانیاں دیں اور جو ظلم وستم برداشت کئے اس کا صلہ عوام کو بہر حال دینا ہی تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو دے ہی دیا۔

اس روز ان کی ہدایت پر گورنر ایل۔ کے۔ جھا نے دفعہ ۹۱ کے تحت وہ فرمان جاری کیا جسے پبلک سیفٹی آرڈی نینس کا نام دیا گیا۔

حالانکہ عملی طور پر یہ گلا گھونٹنے کا آرڈی نینس تھا۔ جسے ایک خوبصورت نام سے مشتہر کیا گیا۔ اس فرمان کی رو سے ....

.... حکومت جموں وکشمیر نے ریاست کی سلامتی اور امن عامہ قائم رکھنے کے بہانے بیک وقت اخبارات اور دیگر مطبوعات پر پابندی عائد کرنے، پریس کو شکنجے میں کسنے اور لوگوں کو وجہ بتائے بغیر نظر بند کرنے

کے وسیع اختیارات حاصل کر لئے۔[1]

یہ رسوائے زمانہ آرڈی نینس جاری کر کے حکومت کسی بھی شخص کو اس کی نظر بندی کے وجوہات بتائے بغیر قید کر سکتی ہے۔ کسی بھی قیدی کو اس کا کیس کسی مشاورتی بورڈ کے سامنے رکھے بغیر دو سال تک نظر بند رکھ سکتی ہے۔

پہلے نظر بندی حکم کے معیاد گزر جانے یا منسوخ کئے جانے کے بعد دوسرے نظر بندی حکم کے اجراء پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔

یہ فرمان ریاست کے اندر شائع ہونے والے اخبارات، رسائل اور کتابیں بند کر سکتا ہے۔ اگر سرکار یہ محسوس کرے کہ ان میں شائع شدہ مواد ریاست کی سلامتی اور امن عامہ کے لئے ضرر رساں ہے۔

یہ آرڈی نینس ریاست کے ممنوعہ علاقے کے اردگرد گھومنے کو بھی خلاف قانون قرار دیتا ہے۔ کوئی بھی پولیس آفیسر یا سرکار کی طرف سے کوئی بااختیار شخص کسی بھی آدمی کو ایسے ممنوعہ علاقے میں داخل ہونے، وہاں موجود ہونے یا وہاں سے روانہ ہونے پر تلاشی لے سکتا ہے۔ اس قسم کی تلاشی کے لئے کسی شخص یا موٹر گاڑی کو روکا جا سکتا ہے۔ دفعہ ۹۱ کی خلاف ورزی کرنے والوں کو دو ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جا سکیں گی۔ اس دفعہ کی رو سے اگر حکومت ضروری محسوس کرے تو وہ حکم کے ذریعے

---

[1] راقم نے "تحریک حریت" کے پس منظر میں اپنی کتاب "یہ کس کا لہو ہے کون مرا" پریس میں چھاپنے کے لئے دی تھی جو وہاں افشا ہو گئی۔ پولیس نے بیک وقت پریس اور میرے گھر پر چھاپہ مار کر اس کا سارا مواد ضبط کر لیا۔ وزیر اعلیٰ کو یہ سارا مواد دکھایا گیا تو انھیں پتہ چلا کشمیر میں ایسے بھی قلمکار ہیں جو دوسروں کی طرح خاموش تماشائی بن کر نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ حقایق لوگوں کے سامنے لا کر ان کی حکومت کو پریشان کر سکتے ہیں۔

جیسا کہ انھوں نے اسمبلی میں اس بارے میں کہا بھی اور تب ہی سے انھوں نے اس قسم کا لٹریچر اور اس کا تخلیق کار پابند سلاسل کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔

THE UNIVERSITY OF MICHIGAN LIBRARIES

کسی بھی شخص کے کسی خاص علاقے میں داخلے کو ممنوع قرار دے گی، خلاف ورزی کرنے والے کو تین ماہ کی قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔ اِس آرڈی نینس کے ذریعے حکومت ایک عام یا خاص حکم کے ذریعے کسی علاقے میں کسی فوجی نوعیت کی مشق یا نقل و حرکت کو ممنوع قرار دے سکتی ہے یا اس کو محدود کرسکتی ہے۔

اِس دفعہ کی خلاف ورزی کرنے والے کو چھ ماہ قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

ایک اور دفعہ کا تعلق کرفیو آرڈر کے نفاذ سے ہے۔ کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی کرنے والے کو چھ ماہ قید تک کی سزا دی جاسکے گی۔ اِس آرڈیننس کے تحت اگر کسی شخص کو ضرر رساں کارروائی کرنے کا قصوروار ٹھہرایا گیا تو اسے دو سال تک قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جاسکیں گی۔

قابلِ اعتراض خبروں کی اشاعت پر کنٹرول کرنے سے متعلق دفعہ کی رو سے اگر حکومت کی رائے میں کوئی دستاویز جو آرڈی نینس سے پہلے یا بعد میں چھاپی گئی ہو یا شائع کی گئی ہو، کوئی ضرر رساں خبر شامل رکھتی ہو، تو حکومت ریاست کی سلامتی کے مفاد اور امنِ عامہ کے قیام کی خاطر یہ حکم دے سکتی ہے کہ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر یا وہ شخص جس کے قبضے میں ایسی دستاویز ہو اس حکم میں مقررہ اتھارٹی کو ایسے شخص کے نام اور پتہ کے بارے میں مطلع کرے۔ جو ایسی خبر دینے سے تعلق رکھتا ہو، ایسی دستاویز اور اس کی نقل مقررہ اتھارٹی کے سپرد کرنے کا حکم بھی دے سکتی ہے۔"

نیشنل کانفرنس کی جیسی عوامی حکومت کے اِس آرڈی نینس نے سنجیدہ عوام کو جہاں دم بخود کردیا۔ وہاں اپوزیشن پارٹیوں کے علاوہ غیر ریاستی تنظیموں نے بھی اس کے خلاف سخت احتجاج کیا، اسے ایک جابرانہ قانون اور بلا اعلان ایمرجنسی سے تعبیر کیا۔

ریاست جموّں وکشمیر کے عوام کو اپنے قائد اپنے لیڈر اور اپنے حکمران سے اس قسم کا واسطہ پڑا تو پڑھے لکھے لوگوں، سنجیدہ افراد اور دانشوروں کے پاؤں تلے گویا زمین نکل گئی۔ اِس چنگیزی حکم نے ان سبھوں کو حواس باختہ کردیا۔

عقل وشعور رکھنے والے لوگ نیشنل کانفرنس کی لیڈر شپ کو ظالم وجابر حکمران جاننے میں کوئی پس وپیش نہیں کرسکے۔

اِس چنگیزی حکم کے خلاف سب سے زیادہ احتجاج جمّوں میں کیا گیا۔ جمّوں میں اِس آرڈی نینس کی منسوخی کے لئے مختلف پارٹیوں کی ایک سنگھرش سمتی بنائی گئی۔ جس نے جمّوں شہر میں مظاہرے کئے۔

چنانچہ دربار مُو کے سلسلے میں جب وزیر اعلیٰ اور اُن کی کابینہ دیگر دفاتر کے ساتھ جمّوں منتقل ہوگئی تو ان کو زبردست مظاہروں کا سامنا کرنا پڑا۔

جمّوں شہر کے لوگ جو کشمیریوں کی طرح عقیدت کے اندھے نہیں۔ ان کی ناراضگی کو دیکھکر حکومت نے ۱۵ نومبر کو اس چنگیزی حکم کے نفاذ کی دلیل میں ایک وہائٹ پیپر جاری کیا۔ اس میں حکومت نے ایک ایسی دوا تجویز کی جو جمّوں واسیوں کے درد کے لئے تیر بہدف دوا تھی۔

حکومت نے اِس آرڈی نینس کے جاری کرانے کا قصور پاکستان کے سر تھوپ دیا۔ وہائٹ پیپر میں پاکستان کے بارے میں کہا گیا۔

"جمّوں وکشمیر ایک سرحدی ریاست ہے جس کے کئی حصّے بیرونی ملکوں کے قبضے میں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں ریاست کی سلامتی اور امن وقانون کے لئے ایسے مسائل کا سامنا ہے جو ملک کی دوسری ریاستوں کو درپیش نہیں۔"

اِس آرڈی نینس کے ذریعے شیخ محمد عبداللہ نے بحیثیت حکمران ریاست میں تحریر و تقریر کی آزادی اور پریس کی آزادی پر جو کاری ضرب لگادی۔ اِس پر برصغیر میں سخت شور شرابہ ہوا۔ لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی، کیونکہ آج شیخ عبداللہ عوام کے لیڈر نہیں بلکہ حکمران تھے۔

حالانکہ جب وہ صرف لیڈر تھے اور ڈوگرہ شاہی سے ٹکرلے رہے تھے تب تحریر وتقریر اور پریس کی آزادی پر ان کی رائے بالکل مختلف تھی۔

۱۹ جنوری ۱۹۴۲ء کو انھوں نے جمّوں میں ایک پریس کانفرنس میں فرمایا تھا:

"۱۹۳۱ء سے پہلے ریاست میں پریس کی آزادی نہ تھی۔ چنانچہ رعیائے ریاست کا یہ پیدائشی حق حاصل کرنے کے لئے ہمیں کافی قربانیاں دینی پڑیں، مجھے اخبارات، رسائل اور کتابوں کے ساتھ پریم ہے۔ کیونکہ یہ پودا میرے ہی ہاتھوں لگایا ہوا ہے۔ اِس لئے میں اسے پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ ضروری

THE UNIVERSITY OF MICHIGAN LIBRARY

نہیں کہ تمام اخبارات نیشنل کانفرنس کے خیالات کے ساتھ متفق ہوں، کانفرنس کے ساتھ کئی امور پر پریس کو اختلاف ہو سکتا ہے لیکن کانفرنس اس بات کی خواہاں ہے کہ پریس اس قدر مضبوط اور منظم ہو کہ واقعی اسے چالیس لاکھ باشندگانِ ریاست کی صحیح آواز کہا جا سکے، ایک طرف تو پریس کو پبلک کا اعتماد حاصل ہو اور دوسری طرف گورنمنٹ کی نظروں میں بھی اس کا وقار بڑھے اور گورنمنٹ بھی پریس کی آواز کی قدر کرے۔ اس کی آزادی کا خیال رکھے ....."

شیخ محمد عبداللہ جب حکمران نہیں تھے بلکہ عوام کے رہنما اور اپوزیشن کے لیڈر تھے اور بھارت کی حکومت سے برسرِ پیکار تھے۔ انھوں نے ۱۹۶۵ء میں ڈیفینس آف انڈیا رولز کے خلاف آسمان سر پر اُٹھایا۔ اس آرڈی نینس کے خلاف شور مچایا اور بڑی ڈھٹائی سے کہا:

"یہ بات واضح رہنی چاہیئے کہ داروگیر کے قوانین سے انسانی مسائل حل نہیں ہوتے اس قسم کے جابرانہ طریقہ کار سے مظلوموں کے اندر بے اطمینانی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اگر میری رہائی کوئی اہمیت نہیں رکھتی تو بغیر کسی تاخیر کے تمام نظر بندوں کو رہا کیا جائے اور تمام جابرانہ قوانین کو منسوخ کیا جائے جن کے نتیجے میں کشمیر کے اندر شہری آزادی اور اظہارِ خیال کی آزادی دبائی جا چکی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ آر۔ کشمیریوں کو پورے دباؤ کے ساتھ دن رات روندھے جا رہا ہے۔"

شیخ محمد عبداللہ نے میدانِ سیاست میں اُتر کر بحیثیت ایک قومی لیڈر کے مطلق العنان حکمرانوں پر الزامات لگا کر جن باتوں پر انھیں للکارا خود حکمران بنکر انہی باتوں کی آبیاری کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ——— شیخ عبداللہ کی ساری سیاسی زندگی کو نظرِ غائر سے دیکھکر اس کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے جو وہ کہتے تھے کرتے نہیں تھے اور جو کرتے تھے وہ کہتے نہیں تھے ان کے کہنے اور کرنے میں جو تضاد ہے اس کی مثال ساری دُنیا میں ملنی مشکل ہے۔ اپنے ایک روپ میں وہ اپنی زبان سے ایسی باتیں بناتے کہ انھیں دُنیا بھر کے اہم سیاستدانوں پر فوقیت دینا پڑتی تھی۔ ان کے خیالات اور نظریات پر ایمان لانا پڑتا تھا لیکن اپنے دوسرے روپ میں اُنکی زبان سے ہمیں ان سے جو کچھ سننے کو ملتا تو آدمی دم بخود ہو کر ان کا موازنہ کرنے لگتا ——— شیخ محمد عبداللہ کے بارے میں کوئی بھی شخص حتمی طور پر کہہ نہیں سکتا کہ وہ بڑے سیاستدان تھے یا بڑے اداکار، کیونکہ اپنی ساری سیاسی زندگی میں انھوں نے جو اداکاری کی اس کو دیکھکر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی سیاست بڑی ہے یا اداکاری!

(سبسڈی سے محروم ہو کر بھیک مانگنے والی خواتین)



تیس روپے نقد اور تیس روپے اُدھار پر کشمیر کا مستقبل داؤ پر لگا دیا گیا



بھوکے ننگے ہانجیوں سے سبسڈی لے کر ہاؤس بوٹ رکھنے والے
سرمایہ داروں کو دی گئی

کس کو فرصت ہے کہ کرلے اُنکے زخموں کا شمار
بے طرح مرتے رہے جو بے سبب جیتے رہے

راشن پر سبسڈی کی منسوخی

سرمایہ داروں کے لیے سبسڈی کی بحالی

اپنے دور حکمرانی میں عوام پر پبلک سیفٹی ایکٹ کا بھرپور وار کرنے کے بعد شیخ عبداللہ نے ریاستی عوام کے منہ سے نوالا چھیننے کے لئے راشن پر دی جانے والی سبسڈی یعنی رعایت کی منسوخی کا حکم نامہ جاری کرکے ساری ریاست میں کنٹرورسی پیدا کردی، خوراک پر دی جانے والی سبسڈی کی منسوخی کے جواز میں انھوں نے فرمایا:

"خوراک کی اس امداد سبسڈی نے ایسی صورت اختیار کرلی ہے کہ یہ ہمارے خزانے کا ایک بھاری حصّہ ہڑپ کرتی رہی ہے اور دوسری طرف سارے مُلک میں کشمیریوں کو چاول کی خیرات لینے کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ خوراک اور دوسرے میدانوں میں خود کفالت حاصل کرنے کا سارا خواب درہم برہم ہوکر رہ گیا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ انڈے سے لے کر بینگن بلکہ چارے تک ہر ایک چیز کے لئے ہمیں بیرون ریاست کی منڈیوں کی طرف ہاتھ پھیلانے پڑ رہے ہیں۔"

وزیراعلیٰ شیخ عبداللہ نے ۱۹۵۳ء سے اپنی معزولی اور گرفتاری کے بعد برسوں تک ریاستی عوام پر سستے چاول کھانے کا طعنہ دیا، جب وہ ہندوستان کو اپنا مُلک سمجھتے نہیں تھے اور ہمیں [illegible]یا کرتے تھے ہندوستان ایک جابر اور غاصب ملک ہے جس نے ریاست پر ناجائز [illegible] کرلیا ہے۔ تب تک تو سستے چاول کھانے کا طعنہ کسی حد تک موزوں تھا لیکن اقتدار [illegible] کرنے کے بعد ہندوستان کے ساتھ ریاست کا الحاق ناقابلِ تنسیخ مان کر سستے چاول

کھانے کا طعنہ دینا قطعاً ناموزوں و نامناسب تھا۔ اپنے مُلک کی رعایا اگر کوئی چیز سستی اور کوئی مہنگی کھائے تو اس میں ایسی کوئی برائی نہیں جس کا واویلا کیا جائے۔ چونکہ یہ کام بخشی غلام محمد نے شروع کیا تھا۔ جو شیخ صاحب کی نظروں میں غدار تھا (حالانکہ اُن سے یہ خطاب چھین لیا گیا) بخشی غلام محمد کا کوئی بھی کام چاہے وہ صحیح اور موزوں ہی کیوں نہ ہو اس کی مخالفت کرنا شیخ عبداللہ کا فرضِ اولین تھا۔


(بخشی غلام محمد)

وزیراعلیٰ شیخ محمد عبداللہ نے ریاستی عوام کو سستے چاول کھانے کا طعنہ کچھ اس طرح دیا گویا ہندوستان میں یہ واحد ریاست تھی جسے راشن میں رعایت ملتی تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ راشن پر رعایت صرف ریاست جمّوں وکشمیر کو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دوسری اِن ریاستوں کو بھی ملتی تھی (ان کو اب بھی ملتی ہے) جو خوراک کے معاملے میں خود کفیل نہیں اور جہاں کی انڈسٹری نہایت ہی محدود ہے۔

مرکزی سرکار اپنی ۲۵ ریاستوں میں سے ۸ ریاستوں کو جن میں جمّوں وکشمیر بھی شامل ہے راشن پر رعایت دیتی ہے اور مرکزی سرکار اس پر سالانہ دو ارب روپے صرف کرتی ہے۔

اِن دو ہزار کروڑ روپے میں جمّوں وکشمیر کی ریاست کے حصّے میں سالانہ بیس کروڑ روپے آتے تھے۔

چونکہ ریاست جمّوں وکشمیر کے لئے راشن پر سبسڈی بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ کی گرفتاری کے ساتھ وابستہ کرائی تھی۔ اس لئے ان کی نظر میں یہ ایک گناہ تھا۔ لہٰذا اس گناہ سے جتنی جلدی نجات ملے اتنا ہی اچھا ہے۔

راشن پر سبسڈی کے اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کی منسوخی کا وزیراعلیٰ کا فیصلہ ایک غلط فیصلہ ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مکمل طور سبسڈی منسوخ کرنے کے بجائے اگر اس کے لئے مستحق اور غیر مستحق کا خیال رکھا گیا ہوتا تو یہ یقیناً ایک قابلِ قدر اقدام ہوتا۔

ہماری ریاست میں راشن پر سبسڈی وہ لوگ بھی حاصل کرتے تھے جو ہرگز ہرگز اس کے مستحق نہیں تھے۔ لیکن آج بھی یہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اس رعایت کے حقدار ہیں۔

اِس رعایت کی منسوخی میں امیر اور غریب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک کر وزیراعلیٰ نے ہرگز

مندی کا ثبوت نہیں دیا۔ اس لئے کہ مشاہدے میں آیا ہے کہ اس رعایت سے محروم ہونے والے
ن حاصل کرنے کے لئے کئی گھرانوں نے رفتہ رفتہ اپنا اثاثہ بیچ دیا۔ بعض گھرانوں نے اپنے زیورات
برتن وغیرہ بیچ دیئے۔ اتنا ہی نہیں کئی گھرانوں کے بچّے تعلیم چھوڑ کر روزگار حاصل کرنے کے
مجبور ہو گئے۔

راشن پر رعایت کی قدر قیمت وہ لوگ ہرگز نہیں جان سکتے جو کھاتے پیتے گھرانوں سے
تعلق رکھتے ہوں۔ بلکہ وہ لوگ جانتے ہیں جو محدود آمدنی میں گزارہ کرتے ہیں۔ وزیراعلیٰ نے راشن
پر دی جانے والی ان رقومات سے سڑکیں تعمیر کرنے، پُرانے پلوں کی مرمت اور نئے پلوں کو بنانے
پر صرف کرنے کی جو تجویز رکھدی۔ وہ بظاہر ایک صحیح تجویز تھی مگر اس کے باوجود بھی ہماری
سڑکوں اور پلوں کی جو حالت ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک مد سے
رقومات نکال کر دوسری مد میں ڈال کر ضائع کر دی گئیں تو ہرگز غلط نہیں ہوگا۔

یہ بات قابلِ ستائش تھی کہ وزیراعلیٰ کو احساس ہو گیا کہ ہماری زرخیز وادی آج انڈے
سے لے کر بینگن تک بیرونِ ریاست کی منڈیوں کی محتاج ہے اور اس کی ایک خاص وجہ یہی ہے
کہ خزانہ عامرہ راشن پر سبسڈی کا بوجھ برداشت نہیں کر رہی ہے۔

لیکن پوچھا جا سکتا ہے، راشن پر سبسڈی کے خاتمے کے بعد کیا ہم ضروریاتِ زندگی کے
بارے میں پانچ فیصد بھی خود کفیل ہو گئے ہیں ــــ؟ نہیں!

مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ راشن پر سبسڈی ختم ہونے کے باوجود بھی ضروریاتِ زندگی
کی ہر شئے کے لئے ہم بیرونِ ریاستوں کے محتاج ہیں اور یہاں آج بھی ایسے لوگوں کی کوئی کمی
نہیں جو راشن پر اس رعایت کے بالکل مستحق ہیں۔

شیخ صاحب کو بخشی صاحب کا یہ فیصلہ منسوخ کرنا تھا سو کر لیا۔ لیکن حالات اور واقعات
شاہد ہیں کہ شیخ محمد عبداللہ نے غریبوں، محتاجوں اور لاچاروں سے رعایت واپس لے کر یہ
رعایت امیروں، رئیسوں اور سرمایہ داروں کو دی۔

ریاست کے دولتمندوں کو دولت سے مالا مال کیا گیا۔ ہزاروں اور لاکھوں روپے کی
سبسڈی کے لالچ میں بعض سرمایہ داروں اور اثر و رسوخ رکھنے والوں نے اپنی کوٹھیوں کو
گیسٹ ہاؤسوں میں بدل دیا۔

ایک ہوٹل کے مالک نے دوسرا ہوٹل بنایا۔ ایک ہاؤس بوٹ رکھنے والے نے دو اور تین